2036/

علامہ اقبال

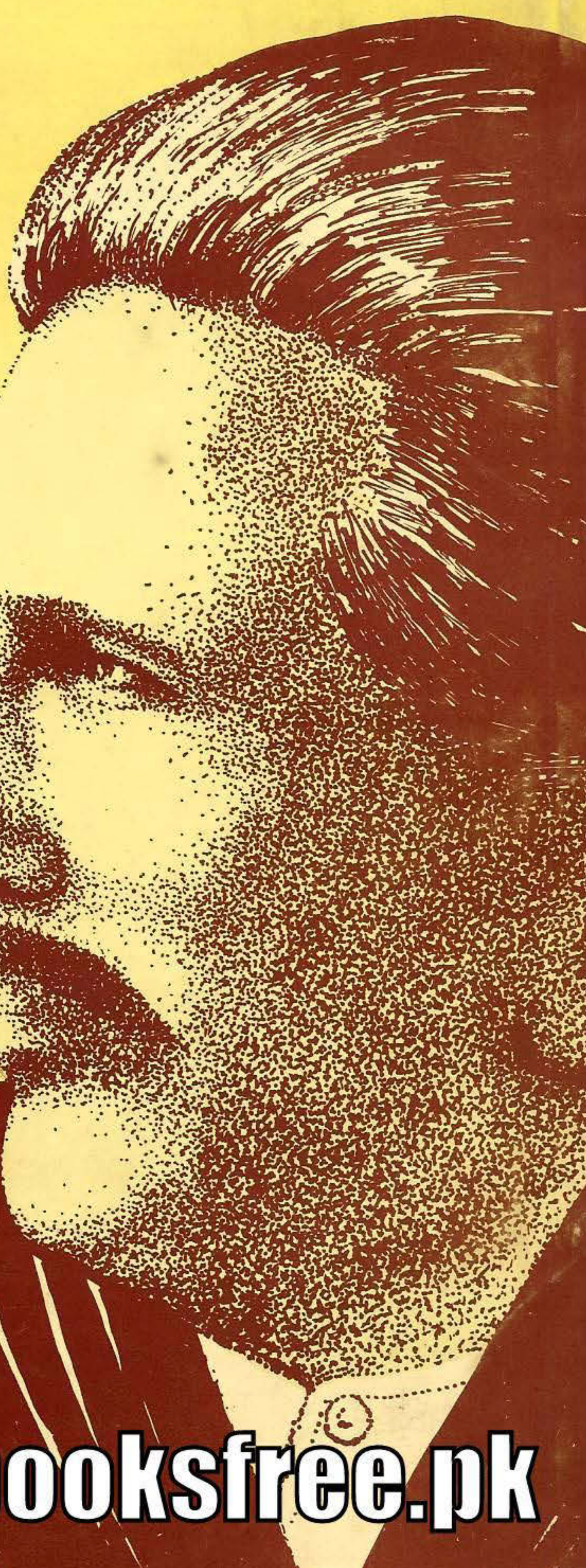

شریف المجاہد

www.pdfbooksfree.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

606

سوانحی مطالعہ ۔۔۔۔۔۔ ۶

علامہ اقبال

www.pdfbooksfree.pk

PVL

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfboosfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علامہ اقبال

www.pdfbooksfree.pk

شریف المجاہد

قائداعظم اکادمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناشر: قائداعظم اکادمی
۲۹۷۔ ایم اے جناح روڈ کراچی ۵

جملہ حقوق: بحقِ مصنف محفوظ ہیں۔

طبع اوّل: اگست ۱۹۸۵ء
طبع دوم اگست ۱۹۸۶ء
کتابت: ایم۔آر۔ایس
سرورق: رشید صدیقی
طابع: احمد برادرز پرنٹرز
کمرشل ایریا ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸

قیمت: غیر مجلد ۷ روپے
مجلد ۱۵ روپے

www.pdfbooksfree.pk

اس کتاب میں جن خیالات، نظریات، توضیحات و تشریحات سے کام لیا گیا ہے، وہ خالصتاً مصنف کے اندازِ فکر اور تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ قائداعظم اکادمی یا کوئی اور ادارہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

فہرست

مقدمہ

حرفِ آغاز ۹

۱۔ ایک نیا شاعر ۱۱

۲۔ نوجوان اقبال ۱۳

۳۔ اقبال کا فکری ارتقاء ۱۸

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۴۔ شاعرِ اسلام ۲۷

۵۔ اقبال اور پاکستان ۴۲

۶۔ پیامِ اقبال ۴۹

۷۔ اقبال کے آخری ایّام ۵۶

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

علامہ اقبال ہماری قومی اور ملّی جدوجہد کی ایک تابندہ علامت ہیں۔ ان کی شاعری اور فلسفہ دونوں اپنے اندر ایک فکری اور عملی پیغام رکھتے ہیں۔ ایک ایسا پیغام جو قرآن و سنّت کی روشنی میں تعمیری اور مثبت قدروں سے تشکیل دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمارے اجتماعی شعور کو بیدار کیا اور ایک ایسا ذہنی انقلاب برپا کر دیا جو مصائب و مسائل کی تندی میں مسلمانانِ ہند کے لئے رہنما کردار ادا کرتا رہا۔ نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ عالمِ اسلام کو بھی اس پیغام نے اپنے تشخص کی بازیافت کے لئے میدانِ عمل میں آنے پر آمادہ و تیار کیا۔ اس اعتبار سے علامہ اقبال کی حیثیت عالمِ اسلام کے ایک محسن کی سی ہے۔

علامہ اقبال کو ہر لمحہ ایک نئی دنیا اور ایک نئی زندگی کی تلاش و جستجو رہتی تھی۔ اس نئی دنیا اور نئی زندگی کی تعمیر نئی نسل کے ہاتھوں ہی ممکن ہے۔ علامہ اقبال نے خود بھی اپنی شاعری میں جابجا نئی نسل کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فکر و عمل کی دعوت دی ہے۔ اس لئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور میں نئی نسل کو اقبال کے پیغام سے متعارف کرایا جائے تاکہ ہر زمانہ اور ہر دور میں نئی نسل ملّی تقاضوں کے پیشِ نظر پیغامِ اقبال سے رہنمائی حاصل کرتی رہے۔

پاکستان میں علامہ اقبالؒ کی حیات و خدمات اور ان کی شاعری کے حوالے سے خاصا وقیع اور قابلِ قدر کام ہوا ہے اور اب بھی اس ضمن میں تحقیق و تصنیف کا سلسلہ جاری ہے، مگر اس کے باوجود کسی ایسی کتاب کی ضرورت ایک عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی جو اسکول اور کالج کی سطح پر نئی نسل کے اذہان میں اس حقیقت کو روشن کر سکے کہ وہ کیا خدمات تھیں جن کی بنا پر علامہ اقبال "شاعرِ مشرق"، "شاعرِ اسلام" اور "مفکرِ پاکستان" جیسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

التفات سے سرفراز ہوئے۔

پروفیسر شریف المجاہد نے جو ایک مؤرخ و محقق کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں آج سے تقریباً چوبیس ۲۴ سال قبل اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے انگریزی میں ایک کتاب تصنیف کی تھی، جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے لندن سے شائع کیا تھا۔ اب انہوں نے اردو میں اسی نوعیت کی کتاب تصنیف کی ہے۔ میں نے اس کتاب کا مسودہ دیکھا اور مجھے خوشی ہوئی کہ پروفیسر شریف المجاہد نے نئی نسل کی ذہنی سطح کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب میں اقبال کی حیات و خدمات کو نہایت سلیس، سادہ اور عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اقبال کی شخصیت کے بعض پہلوؤں، خصوصاً شاعری کے ضمن میں تشریحی اور تجزیاتی انداز بھی اختیار کیا ہے لیکن پیرایۂ بیان اس قدر شائستہ اور دل میں اتر جانے والا ہے کہ تفہیم میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف نئی نسل کے لئے اقبال فہمی میں معاون و مددگار ثابت ہوگی بلکہ اقبالیات کے شعبہ میں بھی ایک اہم اضافہ قرار پائے گی۔ میں اس کتاب کی تصنیف و اشاعت پر پروفیسر شریف المجاہد اور قائداعظم اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو مطالعہ اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(ریٹائرڈ) لیفٹیننٹ جنرل جمال سید میاں
ہلالِ امتیاز، ستارۂ بسالت
وفاقی وزیر برائے ثقافت، کھیل اور سیاحت
چیئرمین بورڈ آف گورنرز قائداعظم اکادمی

اسلام آباد
۲۵ جولائی ۱۹۸۵ء
۶ ذیقعد ۱۴۰۵ھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرفِ آغاز

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر اور فلسفی تھے۔ اپنی زندگی میں ہی وہ "شاعرِ مشرق" اور "مفکرِ اسلام" کہلائے جانے لگے۔ انہوں نے اپنی ولولہ انگیز شاعری کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کیا۔ ان میں زندگی کے مصائب و مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کیا اور ان کی سوچ و فکر کو ایک ایسی جہت عطا کی جو انہیں ان کے تابناک مستقبل کے قریب تر کرتی تھی۔ ایک باشعور مسلمان کی حیثیت سے علامہ اقبال کا ایمان تھا کہ مسلمان اپنی ناگفتہ بہ حالت کو اسی وقت بہتر بنا سکتے ہیں جب وہ اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل کریں۔ چنانچہ انہوں نے احکامِ خداوندی اور عشقِ مصطفویؐ کی روح کو اپنے افکار کی اساس قرار دے کر اسلامیانِ ہند کے قلب و ذہن کو ایک عظیم فکری انقلاب سے آشنا کر دیا۔ اقبال کی یہی وہ خدمات ہیں جن کا تاریخ میں ہمیشہ سنہری الفاظ میں تذکرہ کیا جائے گا۔

موجودہ کتابچہ کا مقصد ثانوی اسکول اور کالج کے طالب علموں کو علامہ اقبال کی زندگی کے حالات سے آگاہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر کوشش کی گئی ہے کہ زبان سادہ و سلیس اور اندازِ بیان میں ممکنہ حد تک تشریح و وضاحت سے کام لیا جائے تاکہ نفسِ مضمون کی تفہیم آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ مطالعہ کے دوران میں طالب علم کی معلومات میں اضافہ ہو۔ چنانچہ جہاں کسی رہنما کا نام آیا ہے وہاں اس کی ولادت و وفات کی تعیین بھی درج کر دیئے گئے ہیں۔ اقبال کی تعلیمات، تصوّرات اور خیالات کی تفہیم کے لئے ان کے کلام کا حوالہ بہت ضروری ہے چنانچہ جگہ جگہ ان کے ایسے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں جو ان کے خیالات کو روشن اور ان کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیغام کو پوری طرح واضح کرتے ہیں۔ اگر کہیں فارسی کا کوئی شعر آیا ہے تو اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی معروفِ زمانہ "دُعا" کو بھی اقبال، بے، کے عکسِ تحریر میں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ نئی نسل اقبال کے "خط" سے بھی آشنا ہو سکے۔ اقبال کی حیات اور کارناموں کے بیان میں ہم نے اس بات کی بھی پوری کوشش کی ہے کہ ہر طرح کی مبالغہ آمیزی سے پرہیز کرتے ہوئے صرف ایسے حقائق پہ انحصار کیا جائے جن کے نشان و آثار تاریخ میں موجود ہیں۔ مزید برآں اس کتابچہ کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب اپنی جگہ مکمل ہے۔

تقریباً چوبیس سال قبل میں نے ایک کتابچہ علامہ اقبال سے متعلق طالب علموں کے لئے انگریزی میں لکھا تھا جسے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے لندن سے شائع کیا تھا۔ یہ کتابچہ اب نایاب ہے۔ چنانچہ یومِ آزادی کے سلسلہ میں تشکیل شدہ کمیٹی برائے نشر و اشاعت کا یہ مشورہ اور فیصلہ تھا کہ میں علامہ اقبال پہ اسی نوعیت کی ایک کتاب اردو میں بھی تحریر کروں۔ میں اس سلسلہ میں خصوصاً ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، پروفیسر نذیر احمد اور جناب ایم بی خالد کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف یہ مشورہ دیا بلکہ اس کتابچہ کو ۱۹۸۴ء میں جشنِ یومِ استقلال کے موقع پر شائع کی جانے والی کتب کی فہرست میں شامل بھی کر لیا۔

مزید برآں میں ثقافت، کھیلوں اور سیاحت کے وفاقی وزیر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) جمال سید میاں کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتابچہ پر ایک فکر انگیز مقدمہ تحریر کیا جس کی بناء پر اس کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

پیشِ نظر کتاب کے مسودہ پر نظرِ ثانی جناب احمد ہمدانی اور خواجہ رضی حیدر نے کی ہے جس کے لئے میں دونوں حضرات کا ممنون ہوں۔

شریف المجاہد

قائداعظم اکادمی

۱۴ اگست ۱۹۸۵ء

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

ایک نیا شاعر

انیس سو کا سال تھا۔ مقام لاہور اور تقریب انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ اجلاس۔ اس موقع پر دلچسپی کا مرکز وہ نیا تعمیر شدہ اسٹیج تھا جو قمقموں سے تقریباً نور بنا ہوا تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس رات چودھویں کا چاند اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ تقریب کے آغاز سے بہت قبل ہی لوگ جوق در جوق جلسہ گاہ میں پہنچ رہے تھے۔ ان لوگوں میں امیر بھی تھے اور غریب بھی۔ تعلیم یافتہ بھی تھے اور غیر تعلیمیافتہ بھی۔ ان میں کوٹ پتلون میں ملبوس افراد بھی تھے اور شیروانی پائجامہ زیب تن کئے ہوئے بھی۔ اور ایسے لوگوں کی بھی خاصی تعداد تھی جو پنجابی روایتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ بہت جلد جلسہ گاہ میں ہزاروں افراد جمع ہو گئے۔ یہ افراد یہاں صرف اس لئے آئے تھے کہ وہ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل سے دلچسپی رکھتے تھے۔

بالآخر جلسہ کا آغاز اسلامیان ہند کی روایت کے مطابق قرآنِ حکیم کی تلاوت سے ہوا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا اور حسبِ دستور صدر جلسہ مولانا نذیر احمد نے انجمن کی روئیداد پیش کرتے ہوئے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ انجمن حمایت الاسلام کس طرح اور کن کن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سطحوں پر تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے۔ مجمع نے صدرِ جلسہ کی تقریر بہت غور سے سنی اور تالیوں کی گونج میں انجمن کی کارکردگی کو خراج تحسین پیش کیا۔ بعد ازاں دیگر کئی اراکین نے بھی تقریریں کیں اور نظمیں سنائیں۔ اس تمام کارروائی کا مقصد یہ تھا کہ لوگ انجمن کے مقاصد کی تکمیل میں دلچسپی لیں اور فراخدلانہ عطیات کے ذریعہ انجمن کے کاموں کو آگے بڑھانے میں تعاون کریں۔

تقریب کی کارروائی کو تقریباً چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ صدر جلسہ نے ایک نئے نام کا خطاب کے لئے اعلان کیا۔ لیکن یہ نام سابقہ مقررین کے لئے بجائی جانے والی تالیوں کی گونج میں دب کر رہ گیا۔ بہرحال حاضرین کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جب ایک نوجوان شلوار، شیروانی پہنے اور ترکی ٹوپی زیبِ سر کئے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس نوجوان کا رنگ صاف بلکہ بہت صاف تھا۔ میانہ قد، چوڑے شانے، سیاہ مونچھیں، گہری بھوری آنکھیں اور سب سے نمایاں کشادہ اور چمکدار پیشانی تھی۔ نوجوان کے چہرے سے جہاں ایک طرف سنجیدگی ٹپک رہی تھی وہاں دوسری طرف آنکھیں گہرے تجسس اور غور و فکر کی غمازی بھی کر رہی تھیں۔

اس نوجوان نے اسٹیج پر آکر اپنی نظم کا عنوان بتایا "نالۂ یتیم" اور پھر اپنی مترنم اور سحر انگیز آواز میں نظم سنانا شروع کر دی۔ رات کی خاموشی میں اس نوجوان کی آواز سامعین پر بتدریج ایک کیفیت طاری کرتی چلی گئی اور ان کے قلب نظم کے اک اک شعر پر گرماتے چلے گئے۔ کیونکہ جب شاعر نے اپنی نظم میں یتیم کی اندوہناک داستان بیان کی تو سامعین نے یتیم کے نالہ میں اپنے دلوں کی دھڑکن موجود پائی۔ کیونکہ نوجوان شاعر کی نظم کے یتیم بچے کی طرح اس وقت ہندوستان کے تمام مسلمان خود کو بے آسرا محسوس کر رہے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس نوجوان کی نظم "نالۂ یتیم" پر آبدیدہ ہو گئے اور جب نظم ختم ہوئی تو سامعین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تے پرجوش انداز میں تالیاں بجا کر نوجوان شاعر کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس نوجوان پر شروع سے آخر تک ایک گہری سنجیدگی طاری رہی اور وہ جس خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج پر آیا تھا اسی خاموشی کے ساتھ واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نظم نے سامعین کے قلوب کو اس قدر گرما دیا کہ تقریب کے اختتام پر مذکورہ نظم کی مطبوعہ کاپیاں چار روپے فی کاپی کے حساب سے بہت سے لوگوں نے خریدیں اور تقریباً تین سو روپے انجمن کے فنڈ میں جمع ہو گئے۔ تقریب کے صدر مولانا نذیر احمد نے جو خود بھی شاعر تھے اپنے اختتامی کلمات میں کہا کہ "میں نے انیس و دبیر کے متعدد مرثیے سنے ہیں لیکن "نالۂ یتیم" کی طرح دل لہو کر دینے والی نظم اس سے قبل نہیں سنی۔"

تقریب ختم ہوئی تو انجمن کے اراکین و اکابر نوجوان شاعر کی طرف بڑھے، اس سے بغل گیر ہوئے اور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے تقریباً ہر شخص نے یہی کہا: "آج ایک نئے شاعر نے جنم لیا ہے۔" اور یہ نوجوان شاعر تھے شیخ محمد اقبال جو عصرِ حاضر کے عظیم اسلامی شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

نوجوان اقبال

شیخ محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جو پنجاب اور کشمیر کی سرحد پر واقع ہے۔ ان کے خاندان کا تعلق کشمیر سے تھا جو سپرو شاخ کے برہمنوں سے منسلک تھا۔ سترہویں صدی میں اقبال کے آباؤ اجداد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ایک صدی بعد انہوں نے ایک نئے مقام کی تلاش میں جنوب کی سمت ہجرت کی اور پنجاب کے سرسبز و شاداب علاقوں میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ یہ تبدیلی اقبال کے خاندان کے لئے بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوش آئند واقع ہوئی۔ چنانچہ اقبال کی پیدائش کے وقت ان کے والد ٹوپیوں کا کاروبار کرتے تھے جو ایک درمیانے درجے کا منافع بخش کاروبار سمجھا جاتا تھا۔

اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد (۱۸۳۷ء - ۱۹۳۰ء) تھا۔ وہ ایک خدا ترس اور فقیر منش انسان تھے۔ صوفیا کی صحبت میں رہنا اپنی سعادت جانتے تھے۔ صوفیا کی صحبت نے ان میں معرفت کا ذوق اور حق شناسی کا ایسا جوہر پیدا کر دیا تھا کہ لوگ ان کو ان پڑھ فلسفی کہتے اور بڑی عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اقبال کی والدہ نے صرف ناظرہ قرآن حکیم پڑھا تھا اور نہایت ہی پرہیزگار اور متقی خاتون تھیں۔ اس طرح یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اقبال جس گھرانے میں پیدا ہوئے اس کی فضا یکسر مذہبی اور ماحول پوری طرح اسلامی تھا۔

اقبال کے والد شیخ نور محمد کو مذہب سے گہری وابستگی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق انہوں نے اقبال کی ولادت سے پہلے ——— ایک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر انہوں نے یہ کی تھی کہ ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو اسلام کی خدمت کر کے بڑا نام پیدا کرے گا۔ انہوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑے میدان میں ایک بہت بڑا مجمع ہے اور اس میں وہ بھی موجود ہیں۔ ایک بہت خوب صورت پرندہ لوگوں کے سروں پر اڑ رہا ہے سب لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی کامیاب نہیں ہو سکا۔ آخر وہ پرندہ نیچے آیا اور شیخ نور محمد کی گود میں بیٹھ گیا۔ شیخ نور محمد نے اپنے خواب کی جو تعبیر کی تھی وہ درست ثابت ہوئی کیونکہ کچھ دن بعد اقبال پیدا ہو گئے اور انہوں نے واقعی اپنی قوم اور اسلام کی خدمت کی بنا پر غیر معمولی شہرت و عزت حاصل کی۔

ہر چند کہ اقبال کی پیدائش کی بشارت خواب میں دے دی گئی تھی لیکن ان کا بچپن اوسط درجے کے خاندانوں کے بچوں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔ البتہ شروع ہی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ بات سب پر واضح ہو گئی تھی کہ اقبال ایک زیرک، ذہین، طباع اور غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہیں۔ اس دور کی عام روایت کے مطابق اقبال کی تعلیم مکتب سے شروع ہوئی لیکن اقبال خوش قسمت تھے کہ ان کو مولوی سید میر حسن (۱۸۴۴ - ۱۹۲۹) جیسے استاد نصیب ہوئے جو نہ صرف درس و تدریس میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے بلکہ فارسی اور عربی کے بھی مایہ ناز عالم تھے۔ مولوی سید میر حسن نے جو اقبال کے والد کے ملاقاتیوں میں شامل تھے بہت جلد اقبال کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا اور بحیثیت استاد اپنی خدمات پیش کر دیں۔ مولوی سید میر حسن کی سرپرستی میں اقبال نے عربی اور فارسی زبان کو سیکھنے میں نہ صرف گہری دلچسپی لی بلکہ جلد ہی ان زبانوں پر دسترس حاصل کر لی۔ انہوں نے اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری اور فنی باریکیوں کو بھی مولوی میر حسن سے سمجھا۔ الغرض اقبال نے مولوی میر حسن سے جو کچھ سیکھا وہ ان کی آئندہ زندگی میں جب وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے تو ایک مضبوط بنیاد ثابت ہوا۔ مولوی میر حسن فنِ شاعری پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ ایک مذہبی شخصیت کے بھی مالک تھے چنانچہ ان کی صحبت سے اقبال کے مذہبی جذبہ کو بھی جلا ملی اور ان کو مذہب سے ایک گہرا اور سچا لگاؤ پیدا ہوا۔ مولوی میر حسن کے ہی ایما پر اقبال کو سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں داخلہ دلوایا گیا۔ اس اسکول میں وہ بہت جلد اپنے اساتذہ کے درمیان ایک ہر دلعزیز طالب علم کی حیثیت اختیار کر گئے کیونکہ جہاں وہ اپنے سبق میں گہری دلچسپی لیتے تھے وہاں وہ عادت و اطوار کے اعتبار سے بھی نہایت شائستہ و مہذب تھے۔ اقبال نے ۱۸۹۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور مشن کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسی سال اقبال کی شادی بھی کر دی گئی۔ مشن کالج کے زمانہ طالب علمی ہی سے اقبال نے سنجیدگی سے شعر گوئی اختیار کی۔ درحقیقت وہ میلانِ طبع کے اعتبار سے پیدائشی شاعر تھے۔ مکتب کے زمانہ میں بھی وہ روزمرّہ کے واقعات کو نظم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے اور اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو سنایا کرتے تھے۔ کالج میں تعلیم کے دوران میں انہوں نے مشاعروں میں بحیثیت شاعر شرکت کرنا شروع کی۔ اقبال نے ابتدا میں اپنا کلام مرزا ارشد گورگانوی (۱۸۵۰ - ۱۹۰۶) کو دکھایا۔ بعد میں اپنی چند نظمیں اور غزلیں اردو کے مسلم الثبوت اور صاحبِ طرز شاعر نواب مرزا خان داغ دہلوی (۱۸۳۱ - ۱۹۰۵) کو بطور اصلاح ارسال کیں۔ ہر چند کہ ان کی ابتدائی نظمیں زیادہ فکر انگیز اور متنوع نہیں تھیں لیکن ان کی قدرت شعر گوئی کی بنا پر مرزا داغ دہلوی کا خیال تھا کہ ان میں ایک بلند پایا شاعر بننے کی تمام تر صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ چند نظموں اور غزلوں کی اصلاح کے بعد داغ دہلوی نے اقبال کو لکھا کہ آپ کو مزید اصلاح کی ضرورت نہیں ہے یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ داغ دہلوی جنہوں نے اقبال کی صلاحیتوں کا ابتدا ہی میں اندازہ لگا لیا تھا کچھ ہی عرصے کے بعد اپنی آنکھوں سے وہ دور بھی دیکھا جب اقبال کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس دور میں داغ دہلوی بڑے فخر سے یہ بات کہتے تھے کہ انہوں نے کبھی اقبال کے اشعار کی اصلاح کی تھی۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے وہ داغ دہلوی کا شاگرد ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں داغ دہلوی کی وفات پر انہوں نے ایک بہت ہی درد انگیز مرثیہ لکھا جس میں اردو غزل کے سلسلہ میں داغ کی خدمات کو بے پناہ خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس مرثیہ کے درج ذیل اشعار میں جہاں داغ کی عظمت کا اعتراف ملتا ہے وہاں اقبال کی داغ دہلوی سے ارادت اور عقیدت کا بھی بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

چل بسا داغ آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
اُٹھ گیا ناوک فگن، مارے گا دل پہ تیر کون؟

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد مرزا داغ دہلوی ہندوستان میں اردو کے بہت ہی اہم مایہ ناز اور عہد آفریں شاعر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ داغ دہلوی نے اپنے تجربے اور فنی بصیرت کی بنا پر اقبال میں ایک بڑا شاعر ہونے کی صلاحیتیں دیکھ لی تھیں۔ لیکن یہ بات توجہ طلب ہے کہ اس عہد کے دوسرے شعراء نے بھی اقبال کے بارے میں کم و بیش وہی رائے قائم کی تھی جو داغ کی تھی۔ ان شعراء میں مرزا ارشد گورگانی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جو اس وقت پنجاب کے صف اوّل کے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ ایک موقع پر وہ اقبال کی شاعرانہ صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال کی بیحد تعریف کرتے ہوئے بڑے اچنبھے کی حالت میں کہا "اقبال! اس عمر میں اور اس قدر خوب صورت شعر!

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

جب اقبال تقریباً بائیس سال کے ہوئے تو وہ اعلےٰ تعلیم کے لئے لاہور پہنچے۔ جہاں انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۸۹۷ء میں عربی اور انگریزی میں امتیاز کے ساتھ بی اے کی ڈگری حاصل کی جس کے نتیجہ میں ان کو ایم اے کرنے کے لئے وظیفہ ملا۔ علامہ اقبال نے ایم اے فلسفہ میں کیا اور اوّل پوزیشن حاصل کی اور وہ طلائی تمغہ سے سرفراز کئے گئے۔

ان اعزازات و امتیازات سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ علامہ اقبال نے اپنی یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں ایسے دوست بنائے جنہوں نے زندگی بھر ان سے دوستی نبھائی۔ ان دوستوں میں ایک دوست پروفیسر (سر) تھامس آرنلڈ (۱۸۶۴ء-۱۹۳۰ء) تھے جن کی نگرانی میں اقبال نے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ پروفیسر آرنلڈ انڈین ایجوکیشنل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سروس کے بہترین اساتذہ میں سے تھے اور بعد میں ان کو علیگڑھ کالج اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی پڑھانے کا شرف حاصل ہوا۔ مولوی میر حسن کی طرح پروفیسر آرنلڈ کو بھی نوجوان اقبال کی صلاحیتوں اور لگن کا بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے دورانِ تعلیم میں ہی اقبال کو نہایت قابل، ذہین اور زیرک پایا۔ پروفیسر آرنلڈ اسی لیئے شروع سے ہی اقبال کی طرف متوجہ رہے، ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کی سرپرستی کی۔ وہ نہ صرف اقبال کے مزاج اور طبیعت سے بخوبی واقف ہو گئے تھے بلکہ ان سے مکمل ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ اس طرح اقبال کی تعلیم و تربیت میں پروفیسر آرنلڈ نے بھی اتنا ہی مؤثر کردار ادا کیا جتنا کہ مولوی میر حسن نے۔ اگر مولوی میر حسن نے اقبال کو مشرقی افکار، ادب اور علوم سے متعارف کرایا تھا تو پروفیسر آرنلڈ نے ان کو مغربی افکار، فلسفہ اور تہذیب سے روشناس کیا۔ اقبال کو اس طرح دونوں اساتذہ نے علم کی دولت سے بہرہ ور کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ علم سے بہرہ ور ہونے کے نتیجہ میں اقبال کے یہاں غور و فکر کی عادت پیدا ہوئی اور ان کے خیالات، تصورات اور افکار کو وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ اقبال کی فلسفہ، عربی اور اردو سے وابستگی تمام عمر برقرار رہی ظاہر ہے کہ اس وابستگی میں مولوی میر حسن اور پروفیسر تھامس آرنلڈ کا بڑا حصہ تھا۔

اقبال کا فکری ارتقاء

ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے فوراً بعد اقبال اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے میکلورڈ ریڈر بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کو یہ ملازمت پروفیسر آرنلڈ کی سفارش ہی پر ملی تھی کیونکہ ان کے پاس ایم اے کی ڈگری عربی میں نہیں تھی۔ لیکن پروفیسر آرنلڈ اورنٹیل کالج کے قائم مقام پرنسپل تھے اور انہوں نے علامہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقبال کی عربی کی لیاقت دیکھتے ہوئے سفارش کی تھی۔ اس وقت اقبال کی تنخواہ صرف تہتر روپے تھی۔ اس کے بعد اقبال اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انہوں نے لاہور کے اسلامیہ کالج میں بھی کچھ عرصہ تک پڑھایا۔ دریں اثناء اقبال نے پنجاب سول سروس کے امتحان میں شرکت کی کوشش کی مگر وہ طبی بنیادوں پر غیر موزوں قرار دے دیئے گئے اور ان کو مذکورہ امتحان میں شرکت کی اجازت نہیں ملی۔ اس وقت یقیناً اقبال کے لئے یہ ایک مایوسی کی بات تھی لیکن اگر ہم اقبال کی تمام زندگی کو دیکھیں تو یہ مایوسی اور ناکامی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ یاد رہے کہ مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ - ۱۹۳۱) بھی انڈین سول سروس کے امتحان میں ناکام ہو گئے تھے لیکن بعد میں وہ ایک بڑے سیاسی رہنما کی حیثیت سے ابھرے اور انہوں نے مسلم قوم کی بہتری کے لئے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اسی طرح اقبال بھی سول سرونٹ نہیں بن سکے مگر وہ ایک عظیم شاعر اور مفکر کی حیثیت سے تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا نام چھوڑ گئے۔ انہوں نے اپنے خیالات و تصورات کی بنیاد پر عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ درس و تدریس سے اقبال تقریباً چھ سال یعنی ۱۹۰۵ء تک وابستہ رہے۔ اس دوران میں اقبال کو اپنے پسندیدہ مضامین ——— کا کثرت سے مطالعہ کرنے کا وقت اور موقع ملا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے فلسفہ کا عمیق مطالعہ کیا اور خاص طور پر عقلیت پسندی اور تصوف میں غیر معمولی دلچسپی لی جس سے ان کے تصورات و خیالات میں مزید وسعت اور استحکام پیدا ہوا۔ قوتِ متخیلہ میں اضافہ ہوا۔ ان کے ذہن کے تخلیقی اور تجزیاتی گوشوں میں واضح ارتقاء اور فکری صلاحیتوں میں زیادہ سے زیادہ جلا پیدا ہوئی۔ اس ہمہ جہت ترقی کے عمل سے ان کے اشعار میں فکری گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی اور تخیل ایک مربوط توانائی سے مرصّع ہوا۔ چنانچہ اس دوران میں اقبال ایک ابھرتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاعر کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض میں متعارف ہوئے۔

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان اقبال بالخصوص تین رجحانات سے متاثر رہے اور یہ رجحانات تھے تصوف، رومانیت اور حب الوطنی۔ چنانچہ اس دوران میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں ان میں یہ تینوں رجحانات صاف نظر آتے ہیں۔

تصوف کی روایت میں وہ تمام غزلیں، قطعات اور نظمیں شامل ہیں جن میں بادۂ و ساغر اور ساقی و مینا کے استعاروں کو برتا گیا ہے۔ یہ تمام متصوفانہ شاعری صرف اسلوب ہی کے اعتبار سے روایتی نہیں ہے بلکہ اس دور کی شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ان پر بھی روایت کی گہری چھاپ ہے۔ اس قسم کی شاعری کے سلسلہ میں ان کی نظم "گل پژمردہ" مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں انسان کے احساسِ بیگانگی کی مابعد الطبیعاتی جہت کو اجاگر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے یکسر اجنبی ہے اس کا اصل مسکن وہ جنّت ہے جو اس سے کھو گئی ہے۔ اپنے اصل مسکن سے جدا ہونے کے بعد اس کی صورت ایک مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ہے۔ یہ دو بند دیکھئے۔

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گُل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنّائے دلِ بلبُل کہوں
تھی کبھی موجِ صبا گہوارۂ جنباں ترا
نام تھا صحنِ گلستاں میں گُلِ خنداں ترا
تیرے احساں کا نسیمِ صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطّار تھا
تجھ پہ برساتا ہے شبنم دیدۂ گریاں مرا
ہے نہاں تیری اداسی میں دلِ ویراں مرا
میری برباد کی ہے چھوٹی سی اک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تُو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چو نے از نیستانِ خود حکایت می کنم
بشنو اے گل از جدائیہا شکایت می کنم

(ترجمہ) بانسری کی طرح میں اپنے نیستان کی حکایت بیان کرتا ہوں۔
اے گل سُن کہ میں جدائی کی حکایت بیان کر رہا ہوں۔

اس فارسی شعر کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اپنے ابتدائی زمانے ہی میں مولانا جلال الدین رومی سے کتنے متاثر تھے جس کا واضح سبب ان کا فکری مزاج تھا۔ یہ شعر مولانا رومی سے استفادہ ہے۔ البتہ اس میں نظم کے اسلوب اور خیالات دونوں پر روایت کا اثر ہے لیکن خیالات کو جس ترتیب سے پیش کیا گیا ہے وہ علامہ اقبال کی اپنی قوتِ متخیلہ کا کرشمہ ہے اور قوت متخیلہ کا یہی کرشمہ ان کی انفرادیت کی شہادت ہے۔

ان کی اس دور کی شاعری کا دوسرا رجحان رومانیت ہے جس کے ڈانڈے ان کے بچپن کے ماحول سے ملتے نظر آتے ہیں۔ ان کا بچپن ہمالیہ کی ترائی میں گزرا تھا جہاں قدم قدم پر فطرت کے مناظر نے انہیں اپنی طرف متوجہ کر کے ان کے ذوقِ جمال کی تشکیل کی تھی۔ جب انہوں نے فطرت کو موضوعِ شعر بنایا تو اردو میں پہلی بار ورڈسورڈ (۱۷۷۰-۱۸۵۰) کولرج (۱۷۷۲-۱۸۳۴) اور کوپر (۱۷۳۱-۱۸۰۰) کی روایات کو اپنے طور پر برت کر اردو شاعری کو ایک بالکل ہی نئے انداز سے روشناس کیا۔ یہ شاعری مولانا محمد حسین آزاد (۱۸۳۲-۱۹۱۰) مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴) اور مولانا اسماعیل میرٹھی (۱۸۴۴-۱۹۱۷) کی طرح صرف محاکات ہی کا کھیل نہیں تھا بلکہ اس میں جذبہ، احساس اور خیال کو بڑے سحر کارانہ انداز سے یکجا کیا گیا تھا۔ انہوں نے فطرت کے موضوع پر کئی خیال انگیز نظمیں لکھیں ان نظموں میں "ہمالہ"، "کشمیر"، "کنارِ راوی" اور "ایک آرزو" بہت مشہور و مقبول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ آیئے دیکھیں کہ اقبال آمدِ بہار کی تصویر کشی کس خوبصورت اور دلنشیں انداز سے کرتے ہیں۔

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
مست ترنم ہزار
طوطی و دراج و سار
بر طرف جوئبار
چشمِ تماشا بیار
خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار

ترجمہ:۔ اٹھو کہ پہاڑوں اور بیابانوں میں ابرِ بہار نے اپنا خیمہ لگایا ہے
بلبل نغموں سے مست ہے
طوطی، دراج اور سار بھی
نغمے بکھیر رہے ہیں
جوئبار کی طرف
نظر اٹھا کر تماشا کر
اٹھ کہ پہاڑوں اور بیابانوں میں بہار نے اپنا خیمہ لگایا ہے۔

اقبال کے فلسفۂ فطرت سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے "کنارِ راوی" کے یہ اشعار ملاحظہ کریں۔

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی
پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو
سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی چند نظموں میں اقبال نے صوفیانہ خیالات و تصورات کو مشاہدۂ فطرت سے ربط دے کر بھی پیش کیا ہے اور اس خوبصورت امتزاج نے ان کی شاعری میں تازگی اور تاثیر کا ایک عجیب جادو جگا دیا ہے۔

اقبال کی اس زمانہ کی شاعری میں تیسرا نمایاں رجحان حب الوطنی کا جذبہ ہے حب الوطنی کے ساتھ ان کی نظموں میں وطن پرستی یا وطن دوستی کی چھاپ نظر آتی ہے جو اس زمانے کی عمومی فضا کے لحاظ سے ایک فطری بات تھی۔ ہر چند اس دور کی کچھ نظموں میں تبلیغ و پروپیگنڈہ بھی نمایاں ہو گیا ہے لیکن انہوں نے اس نقص کو بھرپور غنائیت کے پردے میں بڑے فنکارانہ انداز میں چھپایا ہے جو ان کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔ ان کی نظم "نیا شوالہ" بطورِ خاص اسی زمرے میں شامل ہے۔ اس نظم میں شاعر نے برہمن اور ملّا دونوں پر انسانوں کے درمیان اختلافات اور عناد کو فروغ دینے کا الزام عائد کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! اگر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تُو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیش میں بنا دیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہوا اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پریت کی پلا دیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

آپ نے دیکھا کہ لفظوں کی مٹھاس اور مصرعوں کی روانی کس خوبصورتی سے پروپگنڈہ کی بے کیفی کو شعری کیف میں بدل دیتی ہے۔

اسی زمانے میں اقبال نے اپنا مشہور ترانہ ہندی لکھا جو "ہندوستان ہمارا" کے عنوان سے بھی مشہور ہے اور جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اقبال کے ایک غیر مسلم سوانح نگار اقبال سنگھ کے بیان کے مطابق قوم پرستی کے جذبات سے مرصع اس سے بہتر ترانہ آج تک کسی شاعر نے نہیں لکھا۔ اسی زمانے میں اقبال نے "ہندوستانی بچوں کا گیت" بھی لکھا جس میں ہندوستان کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانکؒ نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(یہاں وطن پرستی کے ساتھ تصوف اور بھگتی تحریک کے خیالات قابلِ توجہ ہیں)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ ہی اقبال نے اپنے وطن کے مناظرِ فطرت کی تعریف میں کئی نظمیں لکھیں۔ ہندوستان کے حسین مناظر، طلوعِ سحر، غروبِ آفتاب، اس کے دریاؤں، اس کے پہاڑوں، خوبصورت محلات، اس کے فلک بوس قلعے، اس کے دل افروز باغات اور شاندار مقابر ان کی نظموں کے موضوعات بنے۔ جہاں ان نظموں میں اقبال ہندوستان کی شان و شوکت اور شاندار ماضی کے قصیدہ خواں ہیں وہاں وہ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی روبہ انحطاط حالت پر نوحہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان کی حالتِ زار پر اقبال نے بڑی دل سوزی سے متعدد پُرسوز نظمیں لکھی ہیں اور یہ بات باعثِ حیرت نہیں کہ یہ اشعار ان کے ہم وطنوں کے دل میں اتر جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ سامعین جنہوں نے اقبال کو مارچ ۱۹۰۴ء میں انجمن کے جلسہ میں "تصویرِ درد" پڑھتے سنا تو ان پر رقت طاری ہو گئی کیونکہ اس نظم میں شاعر نے متنبہ کیا تھا کہ

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک؟ لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اقبال کا خیال تھا کہ ایک قوم میں شاعر کا کردار وہی ہوتا ہے جو جسم میں آنکھ کا ہوتا ہے۔ یہاں آنکھ ایک استعارہ ہے جو حالات و کوائف کو بغور دیکھنے اور سمجھنے کا ایک بلیغ اشارہ ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھ کی طرح شاعر بھی اپنی قوم کی مصیبتوں پہ چیخ اٹھتا ہے اور اپنے اشعار میں اپنے ہم وطنوں کے مصائب و آلام کی عکاسی کرتے ہوئے ان میں ایک نئی روح پھونکتا نظر آتا ہے۔ یہ نئی روح انہیں بے خبری کے اندھیروں سے نکال کر آگہی کے اجالوں سے ہمکنار کرتی ہے۔ "تصویر درد" اور "نیا شوالہ" جیسی نظمیں اقبال کے ہموطنوں کے دلی جذبات، آرزؤں اور خیالات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے جب یہ نظمیں مشہور ہوئیں تو اقبال ہندوستان کے قومی شاعر کہلائے جانے لگے اور ان کی شہرت اطراف و اکناف میں پھیل گئی اور ان کی مقبولیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

اقبال صرف ہندوستان کی وطن پرستی کے داعی نہیں تھے بلکہ وہ روزمرّہ زندگی اور ہندوستان میں رونما ہونے والے حالات کے نقاد بھی تھے۔ درحقیقت غزل سے وطن پرستانہ نظموں تک کا سفر صرف موضوع کی تبدیلی ہی نہیں ہے بلکہ یہ سفر ایک بڑی تبدیلی کی بنیاد بھی ہے۔ موضوع میں افادیت اور مقصدیت کے ساتھ اسلوب میں تازگی اور لہجے میں توانائی اس تبدیلی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ گزشتہ دور میں اقبال کی نظمیں ان کے ذاتی جذبات کے اظہار کا ذریعہ تھیں لیکن اب وہ پوری قوم کے احساس و خیالات کی ترجمان نظر آتی ہیں۔ ذاتی جذبات کے اظہار سے قومی احساس کے اظہار تک اس سفر نے اقبال کی شاعری میں ہمہ گیریت اور آفاقیت پیدا کی جو بعد کے زمانہ میں ان کی شاعری کا طرّۂ امتیاز قرار پائی۔

اقبال نے اس طرح اردو شاعری کو ایک اعلےٰ مقصد کے لئے استعمال کیا۔ یعنی اجتماعی طرزِ زندگی اور خیالات و تصورات کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر انہوں نے اپنے ہم وطنوں کی توجہ ملک کے مسائل کی جانب مبذول کرائی اور ان مسائل کو ان کے غور و فکر اور احساس کا مرکز بنایا۔ مزید براں اقبال نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ہندوستان کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے بے عملی کی روش سے نجات حاصل کر کے فلسفۂ عمل و

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرکت کو اپنانے کی سخت ضرورت ہے۔ روایتی فکر کے مطابق اصلِ اصول سکون کو قرار دیا جاتا ہے جب کہ علامہ اقبال نے اصلِ اصول حرکت کو قرار دیا۔

۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۵ء کے دوران لکھی جانے والی اقبال کی بیشتر نظمیں یا تو انجمن حمایت الاسلام کے اجلاسوں یا ادبی اجتماعات میں پڑھی گئیں۔ ان میں سے بیشتر اردو اخبارات اور ادبی رسائل میں بھی شائع ہوئیں۔ ان رسائل میں ماہنامہ مخزن قابلِ ذکر ہے جو خصوصاً پنجاب کا مایہ ناز ادبی رسالہ سمجھا جاتا تھا اور جس کی ادارت سر عبدالقادر (۱۸۷۴ء - ۱۹۵۱ء) کے سپرد تھی۔

شاعرِ اسلام

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ پروفیسر تھامس آرنلڈ جو اقبال کے استاد بھی تھے انہیں بہت زیادہ چاہتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے چنانچہ پروفیسر آرنلڈ کا خیال تھا کہ اعلےٰ تعلیم اور یورپ کا سفر اقبال کے ذہنی ارتقاء اور فکری نشوونما میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ انہوں نے یہ بات اقبال کو بھی یاد کرانے کی کوشش کی۔ اقبال نے پہلے تو تامل سے کام لیا لیکن بعد میں پروفیسر آرنلڈ کا مشورہ قبول کر لیا۔ اس طرح وہ اگست ۱۹۰۵ء میں انگلستان روانہ ہو گئے۔ یورپ روانگی سے قبل اقبال نے دہلی میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دی اور اپنی نظم "التجائے مسافر" نذر کی۔ اس نظم میں اقبال نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مقام و مرتبہ کو بیان کرتے ہوئے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے دعا کی ہے۔

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذّت کشاں کشاں مجھ کو
مقام ہمسفروں سے ہوا اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

یورپ میں اقبال کا قیام تین سال رہا۔ اس دوران انہوں نے مزید اعزازات حاصل کئے اور کیمبرج سے فلسفہ کی ڈگری لی۔ اقبال اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ ان کو کیمبرج میں بھی نہایت شفیق و مہربان استاد میسر آئے۔ خصوصاً پروفیسر ای جی براؤن اور آر اے نکلسن جنہوں نے اقبال کی فکر کو صیقل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

کیمبرج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ جرمنی چلے گئے اور میونخ یونیورسٹی میں مزید تعلیم کے لئے داخلہ لے لیا۔ میونخ میں انہوں نے ایرانی تصوف پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا۔ " The Development of Metaphysics In Persia " اس مقالہ پر اقبال کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ ساتھ ہی انہوں نے قانون کا کورس مکمل کر لیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں وہ بیرسٹر بن گئے

اقبال کے قیام یورپ کے دوران میں ڈگریوں کا حصول کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی بلکہ اصل اہمیت ان کا وسیع مشاہدہ اور مطالعہ کو حاصل تھی جس کے ذریعہ ان کو یورپ کے طرز زندگی اور اندازِ فکر سے آگہی حاصل ہوئی۔ اس دور میں یورپ دنیا کا سب سے اہم اور طاقت ور براعظم تھا۔ وہ علمی و فکری فضیلت کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نمول و دولت کے اعتبار سے بھی دنیا میں سب سے آگے تھا۔ چنانچہ اقبال نے یورپ میں جو کچھ دیکھا اس نے ان کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔

اقبال یورپ کی تین خصوصیات سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ پہلی چیز یورپ کے عوام ہر وقت مصروف رہتے تھے اور اپنے وقت کا بھرپور استعمال کرتے تھے۔ ان کی توانائی اور اختراعی صلاحیت بے پناہ تھی جس کے سبب یورپ کے عوام کا معیارِ زندگی بہت بلند ہو گیا تھا۔ دوم یہ کہ یہاں اقبال کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ سائنس کے امکانات کتنے وسیع تر ہیں۔ سائنس اور سائنسی مطالعہ نے یورپ کو پوری دنیا پر غلبہ عطا کیا۔ نئی مشینیں، نئے خیالات اور نئی ایجادات یہ تمام چیزیں وہ تھیں جن سے ہندوستانی ہنوز نابلد تھے جب کہ یورپ میں یہ نہ صرف عام تھیں بلکہ روزمرّہ کی زندگی میں شامل تھیں۔ ہر روز نئی ایجادات ظہور میں آتی تھیں گویا وہاں کی زندگی میں جد و جہد اور ترقی کا ایک سلسلہ بندھا ہوا تھا تیسرے یہ کہ یورپ کے عوام آسائش کی زندگی اور بار آور سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے آرزومند تھے۔ مسابقت کا یہ رجحان جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ یہ نظام یورپ میں رائج تھا چنانچہ اس طرح کا مقابلہ اور مسابقت یورپ کے طرزِ زندگی میں ایک لازمی شرط تصوّر کی جاتی تھی۔ اسی اصول کی بنا پر یورپ کے باشندوں کا خیال تھا کہ دو قوموں کے درمیان مقابلہ اور مسابقت ایک سودمند رجحان ہے اور اسی رجحان کے نتیجہ میں نیشنلزم اور حب الوطنی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جو ان کے نزدیک ایک قابلِ ستائش جذبہ تھا لیکن اس جذبہ کی تمام تر افادیت کے باوجود یہ بات غور طلب تھی کہ مقابلے اور مسابقت کا یہ رجحان روز بروز ایسی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے جو آخر کار مہلک صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال کو اس کا بہت جلد احساس ہو گیا کہ نیشنلزم کی یہ صورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یورپ کو بڑی تیزی سے جنگ کی طرف لے جا رہی ہے اس لئے اقبال سرمایہ دارانہ نظام اور نیشنلزم سے جو فرد اور قوم کے درمیان بے لگام مقابلہ اور مسابقت کو فروغ دے رہے تھے بد دل ہو گئے۔ اقبال نے مزید محسوس کیا کہ یورپ میں رنگ و نسل کا تعصب بھی بہت عام ہے اور وہاں فرد اور قوم کو انہی بنیادوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ اندازِ فکر انسانی مساوات کے بنیادی اصولوں کے منافی تھا اور ان کو صاف نظر آ رہا تھا کہ یورپ کس طرف جا رہا ہے۔ اپنے اس خدشہ کا اظہار انہوں نے درج ذیل اشعار میں کیا ہے۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

قیامِ یورپ کے دوران میں اقبال کی فکر میں تصوف کے مروجہ تصورات سے بھی اختلاف کے رجحانات پیدا ہوئے۔ کیوں کہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مروجہ تصوف میں فعال زندگی کی بجائے تساہلی اور مسلسل جدوجہد کی بجائے توکل و ترکِ دنیا کا پرچار غالب ہے۔ ایرانی تصوف پر تحقیق کے دوران میں انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ تصوف کا فلسفہ جس رنگ اور جس انداز میں پیش کیا جاتا ہے اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اقبال نے اب دنیا کے مختلف النوع مسائل کے حل کا سراغ اسلام اور اسلامی تعلیمات میں لگانے پر زور دینا شروع کیا۔ مزید مطالعہ اور غور و فکر سے ان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اسلام مسلسل جدوجہد کی تلقین کرتا ہے اور وہ انسان کو اپنے اطراف کے حالات و معاملات پر سوچنے اور غور کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ چنانچہ اقبال اس فیصلہ پر پہنچے کہ قومی کردار کی تعمیر کے لئے ان کو اپنی قوم کو صرف اسلام اور اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عظیم پیغام سے آگاہ و متعارف کرانا ہوگا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانوں کے مابین اور اقوام کے درمیان جو مقابلہ اور مسابقت جاری ہے اس کی برائیوں سے بچنے کے لئے کیا اسلام کے پاس واقعی کوئی حل موجود ہے۔ اقبال نے اس سوال کے جواب کی تلاش میں مغربی تصورات و نظریات کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا لیکن ان میں سے کسی کو بھی ایسا نہیں پایا جس کو وہ بلا کسی ردّوکد کے قابل قبول سمجھتے۔ بالآخر اسلام کے عالمی بھائی چارہ کے پیغام اور اسلامی مساوات کے اصول میں انہوں نے اس سوال کا جواب تلاش کر لیا جیسا کہ تاریخی شواہد سے ظاہر ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھائی چارے اور مساوات کی نہ صرف تبلیغ کی جاتی تھی بلکہ روزمرّہ کی زندگی میں اس کو پوری طرح اپنایا بھی گیا تھا۔ اس دور میں تمام انسان بلا امتیازِ رنگ و نسل آپس میں برابر سمجھے جاتے تھے۔ مثلاً خلیفہ دوم حضرت عمرؓ عرب کے ممتاز قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت بلالؓ ایک حبشی تھے جنہوں نے طویل عرصہ تک غلام کی حیثیت سے زندگی گزاری تھی جب کہ حضرت سلمان پیدائشی طور پر ایرانی نژاد تھے لیکن یہ سب مسلمان تھے اور اس حیثیت میں ایک دوسرے کے برابر تھے۔ چنانچہ اقبال نے یہ محسوس کیا کہ تاریخ عالم میں اسلام کا ابتدائی دور بھی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کی نظیر کسی اور مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں مساوات اور بھائی چارے کی وسیع تر گنجائش موجود ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان خواہ کسی نسل سے ہوں، کسی بھی ملک سے تعلق رکھتے ہوں اور خواہ ان کا رنگ کچھ بھی ہو آپس میں برابر ہیں بلکہ برابر کے حقوق کے حامل۔ اقبال نے یہ بھی دیکھا کہ تاریخ عالم اس کی شاہد ہے کہ اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر مختلف ملکوں کے عوام نے کئی صدیوں تک مسلمانانِ عالم کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے باہمی اشتراک و عمل کا مظاہرہ کیا ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقبال اپنے وسیع مطالعہ اور بھرپور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اسلام نے بھی مکمل جرأت مندانہ فعال زندگی گزارنے کا درس دیا ہے۔ ایسی مکمل اور فعال زندگی جس کا اقبال نے یورپ میں مشاہدہ کیا تھا اور جس کی بنا پر یورپ ترقی کی شاہراہ پہ گامزن تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ یورپ کے متعصبانہ ماحول اور تنگ نظری کی روایات کے برعکس اسلام ایک ہمہ گیر وسیع النظری پہ یقین رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا اصول ہے جو انسانوں کو ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پہ پرکھتا ہے اور ان کے مقام کا تعین کرنے میں کسی تنگ نظری سے کام نہیں لیتا۔ مزید برآں رنگ و نسل کی بنا پر جو امتیازات اور اختلافات رونما ہوتے ہیں اسلام ان کی بھی سراسر مذمت کرتا ہے۔ اس طرح اسلام نے جہاں ایک طرف فعال زندگی بسر کرنے کی دعوت دی ہے وہاں انسانوں کے مابین اور اقوام کے مابین بے رحمانہ مسابقت کو بھی مذموم قرار دیا ہے۔

اسلام نے انسانی برادری اور مساوات پہ زور دیا ہے اور یہی وہ اصول ہے جو نیشنلزم کی خرابیوں اور امتیازِ رنگ و نسل کی برائیوں کا تدارک کر سکتا ہے۔ اس لئے اقبال نے یہ محسوس کیا کہ اسلام میں ایسے اصول موجود ہیں جو جدید دنیا کے مسائل کا حل پیش کر سکتے ہیں اور جن کی روشنی میں ایک ایسے جہانِ نو کی تعمیر ہو سکتی ہے جہاں انسان امن و امان اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔

اس طرح اقبال مسلم دنیا کے اتحاد کی طرف مائل ہوئے کیونکہ ان کی نظر میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں رنگ و نسل اور ملک و قوم کے امتیازات و اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور دنیا کے تمام مسلمان ایک امت یا ملت تصور کئے جاتے تھے۔ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ زمین کا چپہ چپہ میرے نزدیک ایک مسجد ہے۔ اقبال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس ارشادِ گرامی کی روشنی میں اعلان کیا کہ

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

انہی وجوہ کی بنا پر اقبال نے اب یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیں گے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ اقبال نے ایک رومانی اور قوم پرست شاعر کی حیثیت سے ۱۹۰۵ء میں ہندوستان چھوڑا تھا اور جب وہ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے وطن واپس آئے تو وہ اسلام، اسلامی عقائد اور اسلامی اتحاد کے ایک پرجوش مبلغ تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی وطن سے محبت میں کوئی کمی آگئی تھی بلکہ اپنے وسیع مطالعہ اور مشاہدے سے اب وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسائل کا حل صرف اسلامی تعلیمات میں موجود ہے چنانچہ تعلیماتِ اسلامی کو ان کی صحیح صورت میں پیش کرنا پوری نوعِ انسانی کی خدمت ہے۔ ان کے نزدیک اسلام نے معاشرت کے ایسے عالمگیر اصول فراہم کئے ہیں جو صرف ملّت اسلامیہ تک محدود نہیں بلکہ یہ اصول پوری انسانی برادری کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

ایک جرمن شاعر نے ایک مرحلہ پر اعتراف کیا تھا کہ میں دنیا کے ایک ایسے شہری کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں جو کسی بادشاہ کی خدمت پر مامور نہیں۔ میں نے اپنے آبائی وطن کو ترک (نظریاتی طور پر) کر کے پوری دنیا کو اپنا لیا ہے کیونکہ دنیا کی عظیم ترین اقوام بھی قوموں کی حیثیت سے دنیا کے کسی ایک حصہ تک ہی محدود رہتی ہیں۔ اقبال کے پیشِ نظر بھی اب کوئی ایک خطۂ زمین نہیں تھا بلکہ پوری دنیا تھی اور ان کے سخن کا موضوع اب بالخصوص عالم اسلام تھا جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروڑوں انسانوں سے آباد اور مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ علامہ اقبال نے عالم اسلام کو موضوعِ سخن بنا کر اپنے آفاقی نظریہ میں کوئی تناقص پیدا نہیں کیا کیونکہ ہر چند انہوں نے خطاب تو اسلامیانِ عالم سے کیا ہے لیکن اپنے خطاب میں جن اصولوں کی تبلیغ کی ہے وہ آفاقی ہیں۔ ان اصولوں میں رنگ و نسل یا ملک و قوم کی بنیادوں پر کسی طرح کی تمیز کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ان اعلےٰ و ارفع تصورات و نظریات کے ساتھ اقبال ہندوستان واپس آئے اور لاہور میں وکالت کرنے لگے۔ ساتھ ہی انہوں نے گورنمنٹ کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا لیکن وہ اس دور میں اپنے تصوّرات و نظریات کی جانچ پڑتال اور ان کو وسعت دینے میں اتنے مشغول رہے کہ درس و تدریس میں زیادہ وقت صرف نہیں کر سکے۔ جہاں تک ان کی وکالت کا تعلق تھا انہوں نے صرف اسی قدر مقدمے لئے جو ان کے لئے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لئے کافی ہو سکیں۔ باقی ماندہ وقت انہوں نے پڑھنے اور لکھنے کے لئے وقف کر دیا۔ بہت ہی جلد انہوں نے گورنمنٹ کالج کی پروفیسری سے بھی استعفیٰ دے دیا کیونکہ ان کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ سرکاری ملازمت کرتے ہوئے وہ اپنے خیالات و نظریات کا آزادی کے ساتھ اظہار نہیں کر سکتے۔ اس دوران میں علامہ اقبال کو علیگڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی پیش کش کی گئی مگر انہوں نے معذرت کر لی۔

یورپ سے واپسی کے بعد علامہ اقبال کی شہرت و مقبولیت میں دن دونا اضافہ ہوتا رہا اور وہ شاعرِ اسلام کہلائے جانے لگے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ان سے بجا طور پر یہ امید وابستہ ہو گئی کہ وہ ان کے دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی کریں گے اور ان کی رہنمائی کریں گے علامہ اقبال نے اجتماعی احساسات و

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیالات کی ترجمانی اس مؤثر انداز سے کی کہ اب ان کے اشعار کی گونج نجی محفلوں اور جلسوں سے نکل کر گلی کوچوں میں بھی سنائی دینے لگی۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شاعر اپنی قوم کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے اور اس کی شاعری اس کے اپنے عہد کے نظریات و خیالات کی آئینہ دار ہوتی ہے خیالات و نظریات میں تبدیلی کے ساتھ اسلوب کے سانچے بھی بدلتے ہیں۔ لفظیات اور استعاروں کے نئے نئے گوشے کھلتے ہیں۔ چنانچہ اقبال کی شاعری میں بھی یہ ارتقائی عمل جاری رہا۔ پہلے دور میں وہ مناظرِ فطرت اور ہندوستان کی شان و شوکت کے گن گاتے تھے لیکن اب ان کی شاعری اسلام اور مسلمانوں کے جاہ و جلال اور دبدبہ کے ساتھ اسلامی تصورِ حیات و کائنات کی فکر انگیز تفسیریں کرا بھری۔ ماضی میں ان کی شاعری ہندوستانیوں کو قومی بیداری سے ہمکنار کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ تھی لیکن اب وہ تمام عالم کو خود آگہی سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ عظمتِ رفتہ کی بازیافت پر اکسانے کا پُرتاثیر وسیلہ بن گئی۔

اسلامی موضوع پر اقبال نے پہلی نظم ۱۹۰۸ء میں لکھی۔ ہندوستان واپسی پر جب ان کا جہاز جزیرۂ سسلی کے قریب سے گزرا تو اقبال کی آنکھوں کے سامنے عربوں کی پُرشکوہ تاریخ روشن ہو گئی جس کے نتیجہ میں انہوں نے ایک فکر انگیز مرثیہ قلمبند کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایران کے مشہور شاعر شیخ سعدیؒ (۱۱۸۴-۱۲۹۲) نے منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی پر آنسو بہائے تھے۔ اندلس کے ایک عظیم عرب شاعر ابن بدرون (وفات: ۱۱۳۴ء) نے اسپین میں بنو الافطس کے زوال پر مرثیہ لکھا تھا۔ مرزا داغ دہلوی نے ۱۸۵۷ء کا سوگ منایا تھا اور اب اقبال کی باری تھی کہ وہ سسلی (صقلیہ) کی ویرانی پر نوحہ لکھیں۔ وہ سسلی جو ایک زمانہ میں مغرب میں اسلامی تہذیب کا قابلِ فخر مرکز تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اقبال کے نوحہ سے اس حقیقت کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سسلی کی تباہی اور ویرانی سے کس قدر متاثر ہوئے تھے۔ آیئے اقبال کے اس نوحہ میں ان کے دکھ کی شدت سے انکی اس وابستگی کا اندازہ کریں جو انہیں ملت اسلامیہ سے تھی۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہاں تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے ؟

آہ! اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے حال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلّی بحرِ پیما کو رہے
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں
درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگِ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

اقبال کی وطن واپسی کے چند ہی سال بعد مسلم دنیا کو دو بڑے سانحے پیش آئے۔ ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر جو لیبیا کا دارالحکومت تھا اٹلی نے بلا کسی جواز و اشتعال چڑھائی کر دی۔ لیبیا اس وقت ترکی سلطنت کا حصہ تھا۔ کئی لڑائیوں میں اٹلی کا پلہ بھاری رہا اور بالآخر ۱۹۱۲ء کے آواخر میں ترکی کو اٹلی سے صلح کرنا پڑی جس کے نتیجہ میں ترکی کو لیبیا، روڈس اور ڈوڈوکین کے علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا۔ اٹلی سے ابھی جنگ جاری ہی تھی کہ بلقان کی تین ریاستیں یونان، بلغاریہ اور سرجیہ نے آپس میں اتحاد کر کے ترکی پر ۱۹۱۲ء میں حملہ کر دیا۔ کئی جنگیں ہوئیں جن میں ترکی افواج کو پے در پے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اتحادی افواج نے ترکی کے تمام یورپی مقبوضات پر قبضہ کر لیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس کے دارالخلافہ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس طرح ترکی کو جو اس وقت حقیقی معنیٰ میں ایک ہی آزاد اسلامی مملکت تھی۔ نصرانی قوتوں کے ہاتھوں دو سال کے قلیل عرصہ میں دو محاذوں پر ہزیمت اٹھانا پڑی اور وسیع علاقے اس کے علاقے سے نکل گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سانحے مسلمانانِ ہند کے لئے بے حد تشویش و پریشانی کا باعث تھے چنانچہ مسلمانوں میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ برطانیہ ان محاذوں پر ترکی کے دشمنوں کے پشت پناہ کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اقبال بھی اس تشویش اور غم و غصہ کے جذبات میں اسلامیانِ ہند کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ انہوں نے ٹریپولی کے سانحہ سے متاثر ہو کر ایک نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" لکھی۔ یہ نظم جو انہوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ کے بعد ایک عظیم کے اجتماع کے سامنے پیش کی، مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتی تھی اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کی تباہی اور ہزیمت کی عکاسی نہایت دلدوز انداز میں کی تھی۔ چنانچہ یہ نظم سامعین کے دلوں میں اتر گئی اور ان پر رقت طاری ہو گئی۔

اب اقبال کی نظمیں مسلمانوں کے رجحانات، تشویش و پریشانی اور غم و غصہ کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئیں۔ اقبال اپنی شاعری میں مسلمانوں کی مکمل ترجمانی کرنے لگے اور ان کی نظمیں ظالموں و تقدیر پرستوں کے خلاف تازیانہ ثابت ہوئیں امتِ مسلمہ کی محبت سے مغلوب ہو کر انہوں نے مشہور زمانہ نظم "شکوہ" لکھی۔ جس میں انہوں نے خدا تک سے شکوہ کیا جس بات نے ان کو شکوہ کرنے پر مجبور کیا وہ دراصل اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ٹریپولی پر اٹلی کا قبضہ تھا۔ یہ طویل نظم ایک طرح حضرت ایوبؑ کے خدا سے شکوہ کی ایک جدید تمثیل تھی۔ حضرت ایوبؑ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے خدا سے آفات و مصائب کا شکوہ کیا تھا جب کہ اقبال نے خدا سے اپنی قوم پر نازل ہونے والی پریشانیوں اور مصیبتوں کی شکایت کی۔ اقبال نے یہ شکوہ نہایت درد انگیز اور پرجوش انداز میں کیا تھا اور خدا سے سوال کیا تھا کہ اس نے اپنی قوم کو ان آلام و مصائب میں کیوں گرفتار کر رکھا ہے۔ اقبال خدا سے مسلمانوں کے حق میں رحمت کے خواہاں تھے۔ شکوہ اگرچہ ایک طویل نظم ہے لیکن اس کے چند اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اقبال نے کس دل سوزی سے بارگاہِ ایزدی میں شکایت پیش کی ہے۔

امتیں اور بھی ہیں، ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں، مستِ مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں، غافل بھی ہیں، ہوشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

جیسے جیسے اقبال کا شکوہ اپنے اختتام کو پہنچتا ہے اقبال کی مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں تشویش بڑھتی جاتی ہے اور وہ کہتے ہیں۔

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں؟
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہ طویل نظم ۱۹۱۱ء میں اقبال نے انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ اجلاس میں پہلی بار پڑھی اور سامعین بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال نے جب "شکوہ" لکھا تو لوگوں کا خیال تھا کہ "یہ شکوہ" اقبال کا ذاتی شکوہ ہے اور وہ خدا پر غفلت برتنے کا الزام لگا رہے ہیں۔ اگرچہ "شکوہ" کے چند اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا بھی جا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ درست نہیں ہے اس کا اندازہ معترضین کو اس وقت ہوا جب اقبال نے صرف چند ماہ بعد ہی ایک اور طویل نظم "جواب شکوہ" لکھی۔ جہاں "شکوہ" میں انہوں نے مسلمانوں کی توجہ ان کی پستی اور انحطاط کی طرف مبذول کرائی، وہاں "جواب شکوہ" میں انہوں نے اس کے اسباب اور اس کا حل بھی پیش کیا۔ مختصراً "جواب شکوہ" کا پیغام یہ تھا کہ خدا تعالیٰ مسلمانوں سے ناانصافی نہیں کر رہا بلکہ مسلمان خود اپنے ساتھ انصاف نہیں کرنا چاہتے۔

اقبال کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا سبب ان کا اپنی تقدیر پر تکیہ کرنا ہے۔ اگر وہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کریں تو ان کی کوششیں ہی ان کی تقدیر بن جائیں گی۔ آیئے دیکھیں کہ اقبال نے اپنے ان خیالات کو اشعار کے قالب میں کس طرح ڈھالا ہے۔

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ، تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

"جواب شکوہ" کے آخری حصہ میں اقبال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے کھوئے ہوئے عظمت و وقار کو کس طرح از سر نو حاصل کر سکتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ

عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تُو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی زمانے میں اقبال نے اپنا مشہور نغمہ "ترانۂ ملی"، لکھا جو ہندوستانی ترانہ کے طرز اور وزن پر لکھا گیا تھا لیکن یہ ہندوستانی ترانہ سے کہیں زیادہ مؤثر اور ولولہ انگیز تھا چنانچہ وہ فوراً ہی مسلمانوں میں مقبول ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اقبال کے "شاعر اسلام" ہونے کی حیثیت مسلم ہو گئی۔

اقبال بحیثیت شاعر اور مفکر کے ہندوستان گیر شہرت کے حامل تھے۔ وہ مسلسل شعری و فکری کاوشوں میں منہمک رہے۔ چنانچہ انہوں نے اردو اور فارسی کلام پر مشتمل گیارہ دیوان شائع کئے۔ ان میں سے نو ضخیم تھے اور دو مختصر۔ قیام انگلستان کے دوران ایک دوست کے مشورے پر اقبال نے پہلی مرتبہ فارسی میں شعر کہنے کی کوشش کی اور بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ اپنے خیالات و تصورات کو پیش کرنے کے لئے فارسی اردو سے بہتر ذریعہ اظہار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس طرح انہوں نے فارسی میں "اسرار خودی"، لکھی جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی جس کے نتیجہ میں اقبال ایران، افغانستان اور کسی حد تک ترکی اور روس میں روشناس ہوئے۔ کیمبرج کے پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ۱۹۲۰ء میں انگلستان میں شائع کیا۔ اس نظم کے کچھ حصے جرمن اور اطالوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زبانوں میں بھی ترجمہ کئے گئے ہیں۔ اس مثنوی میں اقبال نے کہا ہے کہ انسان جہد مسلسل کے ذریعہ اپنی تعمیر و تشکیل کر سکتا ہے اور اپنی حقیقت کا سراغ پا سکتا ہے۔ انہوں نے ان شاعروں اور صوفیوں پر تنقید کی ہے جنہوں نے عوام الناس کو اپنے ماحول بلکہ اپنے ناگفتہ بہ حالات سے سمجھوتہ کرنے کی تلقین کی اور ہر طرح کی تبدیلی کی کوشش سے باز رکھا۔ مشہور ایرانی شاعر حافظ (۱۳۲۰ء۔۱۳۸۸ء) اور تصوف پر اقبال نے جو شدید نکتہ چینی کی ہے اس پر لوگ بہت برافروختہ ہوئے لیکن اقبال نے نہایت دانشمندی کے ساتھ اپنے خیالات کا دفاع کیا۔ تاہم مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں حافظ کے خلاف اشعار کو حذف کر دیا گیا۔

۱۹۱۸ء میں ان کا دوسرا مجموعہ "رموزِ بے خودی" شائع ہوا جو "اسرارِ خودی" کی طرح فارسی میں تھا۔ "رموزِ بے خودی" میں بھی اقبال نے "اسرارِ خودی" کے خیالات کو از سرِ نو زیادہ پیچیدہ طرز پر پیش کیا۔ اس مثنوی کا موضوع معاشرے میں ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ تعلق ہے۔

اقبال اور پاکستان

۱۹۲۲ء میں اقبال کو سر کا خطاب پیش کیا گیا۔ چونکہ یہ خطاب ان کو علمی خدمات اور فکری کاوشوں کے اعتراف کے طور پر دیا گیا تھا اس لئے انہوں نے اسے قبول کر لیا۔ اس وقت سے وہ ایک عرصہ تک "سر محمد اقبال" کے نام سے پکارے جاتے رہے۔ البتہ قیام پاکستان کے بعد جیسے جیسے ان کی شناخت پاکستان کے فلسفی کی حیثیت سے بڑھتی گئی۔ وہ علامہ اقبال کے نام سے مشہور ہوتے گئے۔ علامہ اقبال نے اگرچہ سر کا خطاب قبول کر لیا تھا لیکن انہوں نے اپنی آزادیٔ اظہار و آزادیٔ افکار میں کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسم کی تبدیلی نہیں آنے دی اور ہمیشہ یہ بات پیش نظر رکھی کہ اپنی قوم کو آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے پر آمادہ و راغب کرنا ان کا فرض اوّلین ہے۔ اس دوران میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ اقبال کا لاہور ہائی کورٹ کے جج کے عہدہ پر تقرر ہونے والا تھا لیکن ان کے چند بیانات میں چونکہ حکومت پر کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی اس لئے ان کو یہ عہدہ پیش نہیں کیا گیا۔

۱۹۲۳ء میں سر میاں فضل حسین (۱۸۷۷-۱۹۳۶) نے جو اس وقت پنجاب کی مسلم سیاست پر چھائے ہوئے تھے اقبال کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ قومی سیاست میں بھی عملی طور پر حصہ لیں۔ میاں فضل حسین اقبال کے بڑے گرویدہ تھے اور سمجھتے تھے کہ اقبال عملی سیاست میں آکر مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ تین سال بعد اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہو گئے۔ علامہ اقبال کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز اسی وقت سے ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے آئندہ بارہ برس میں اقبال نے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ان کو سیاست میں فعال کردار ادا کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ علامہ اقبال کی ہمہ وقت یہ خواہش تھی کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمان ایک متشخص پیدا کریں اور ہندوستان میں ایک پُروقار قوم کی حیثیت سے ان کو پہچانا جائے۔

اقبال کی مسلم لیگ سے وابستگی ان کے قیام لندن سے شروع ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں ان کی وطن واپسی سے چند ماہ قبل ہی وہ مسلم لیگ کی لندن شاخ کی مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کی لندن شاخ بنگال کے ایک ریٹائرڈ جج اور ہسٹری آف سیراسین و دیگر اہم کتابوں کے مصنف سید امیر علی (۱۸۴۹-۱۹۲۸ء) نے قائم کی تھی اور وہ کئی سال تک اس کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ علامہ اقبال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے ۱۹۲۷ء سے پنجاب میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں پوری طرح حصہ لینا شروع کیا اور تین سال کے بعد قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء - ۱۹۴۸ء) کے ایماء پر ان کو آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کی پیش کی گئی۔ علامہ اقبال نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں نہایت یادگار، فکر انگیز اور مدلل خطبۂ صدارت پڑھا جس میں انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ سے متعلق مسائل پر بڑی مفصل گفتگو کی تھی۔ اقبال کو عمومی طور پر تصور پرست خیال کیا جاتا تھا لیکن انہوں نے اپنے خطبۂ الہ آباد میں بعض نہایت اہم ٹھوس اور قابلِ عمل تجاویز پیش کیں۔ اس خطبہ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ اقبال نے اس میں مسلمانانِ ہند کے لئے ایک منزل کا تعین کیا اور یہ منزل تھی ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک متحدہ مسلم ریاست کا قیام ـــــــ انہوں نے فرمایا۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ ریاست سلطنتِ برطانیہ کے اندر حکومتِ خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنا پڑے گی۔"

علامہ اقبال نے مزید کہا کہ

"چنانچہ اس مرحلہ پر میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد کی خاطر ایک منظم اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرتا ہوں۔"

دس سال بعد اقبال کی یہ تجویز مطالبۂ پاکستان کی اساس و بنیاد بن گئی۔ اس طرح برصغیر میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا تصور پیش کرنے کا اعزاز اقبال کو حاصل ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئندہ تین سال تک یعنی ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کے دوران میں متواتر گول میز کانفرنسیں لندن میں منعقد ہوئیں۔ جن میں ہندوستان کے دستور میں ممکنہ ردوبدل اور ان اصولوں پر بحث ومباحثہ ہوا جن کی بنیاد پر مستقبل کا دستور تیار کیا جانا تھا۔ اقبال کو ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس اور نومبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں مدعو کیا گیا لیکن اختلاف رائے کی بنا پر تیسری گول میز کانفرنس میں انہوں نے برائے نام ہی شرکت کی لیکن انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یورپ کا چار ماہ کا دورہ کیا۔ اس دورہ میں انہوں نے علماء فضلاء اور سیاسی رہنماؤں سے بھی ملاقاتیں کیں اور ان سے عالمی، سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔ وہ فرانس، اسپین اور اٹلی بھی گئے۔ خاص طور پر اسپین میں کئی عرب یادگاریں بھی دیکھیں جو مسلمانوں کی عظمت رفتہ اور جاہ و جلال کی آئینہ دار تھیں۔ انہوں نے اسپین کی مسجد قرطبہ میں نمازِ شکرانہ ادا کی جو ۱۲۳۶ء میں نصرانی افواج کے ہاتھوں سقوط قرطبہ کے بعد ایک عیسائی گرجا گھر میں تبدیل کر دی گئی تھی۔ یہاں پر مسلمانوں کے زوال اور ان کو درپیش مسائل کے تصور نے اقبال کو دل گرفتہ و آبدیدہ کر دیا اور انہوں نے ایک نظم کی شکل میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ یہ نظم تھی "مسجد قرطبہ"، جس میں اقبال نے مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کو ایک انقلاب سے ہمکنار کرنے کے لئے جہد مسلسل، جوش و ولولہ اور حرکت و عمل کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

علامہ اقبال کی شاعری میں اس نظم کو بڑی خصوصیت اور ایک خاص امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۴ء کے دوران میں اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ساتھ منسلک رہے۔ یہ کانفرنس ہندوستان کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کروانے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ وہ ۱۹۳۲ء میں مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ جس کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ اپنے صدارتی خطبہ میں انہوں نے قوم کو سیاسی سرگرمیوں کے لئے رہنما اصول پیش کئے اور کہا کہ اگر مسلمان ہندوستان میں باعزت زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو ان کو قربانیاں دینے کے لئے خود کو تیار کرنا پڑے گا۔ یہ تلقین دراصل ان کی ایک نظم "دریوزۂ خلافت" کی بازگشت تھی۔ یہ نظم انہوں نے ہندوستان میں تحریک خلافت (۲۲-۱۹۲۰ء) کے دوران کہی تھی۔

تہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی!

قربانی کا جذبہ پیدا کرنے پر جب اقبال مسلمانوں کو ابھار رہے تھے اس وقت انہوں نے اپنے سامعین کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی تاریخ کے بدترین دور سے ہمکنار ہیں۔ اس لئے انہیں یا تو اپنا قومی فرض ادا کرنا چاہیئے یا نیست و نابود ہونے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ اس زمانہ میں کئی سال تک اقبال پنجاب مسلم لیگ کے صدر رہے قائداعظم سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۸ء میں ہوئی اور پھر ۱۹۳۱ء میں جب یہ دونوں زعماء دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کر رہے تھے تو ان دونوں رہنماؤں کے خیالات میں ایک مخصوص ہم آہنگی محسوس کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے اور گہرے دوست بن گئے۔ ۱۹۳۰ء کے وسط میں اقبال نے قائداعظم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی ان تمام سرگرمیوں کی بھرپور تائید کی جو وہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پہ جمع کرنے اور مسلم لیگ کو ٹھوس بنیادوں پہ از سرِ نو منظم کرنے کے لئے کر رہے تھے پھر ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیان اقبال مسلمانوں کو درپیش مسائل سے متعلق قائداعظم سے مسلسل خط و کتابت کرتے رہے اور ان کو تجاویز پیش کرتے رہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں میں موجود غربت کے مسئلہ پر بہت فکرمند اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے شدید آرزومند تھے۔ مسلسل غور و فکر کے بعد آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ شریعت کے نفاذ سے مسلمانوں کو غربت سے نجات دلائی جا سکتی ہے اور یہی تجویز انہوں نے قائداعظم کو اپنے ایک خط مؤرخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں پیش کی۔ اقبال کا خیال تھا کہ ہندوستان میں ہندو اپنی آبادی کے اعتبار سے بہت بڑی اکثریت میں ہیں اور جب ہندوستان آزاد ہوگا تو وہ حکمران بن بیٹھیں گے اور شریعت کا نفاذ ہندوستان کے آئندہ دستور میں ممکن نہیں ہوگا۔ بہرحال شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان میں کچھ علاقے (مثال کے طور پر پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان اور سندھ مغرب میں اور بنگال شمال مشرقی ہندوستان میں) ایسے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اس لئے اگر ان مسلم اکثریتی علاقوں کو ملا کر ایک علیحدہ ریاست تشکیل دے دی جائے تب شریعت کا نفاذ ممکن ہے۔ چنانچہ اقبال نے قائداعظم کے نام اپنے خط میں ہندوستان میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کے لئے استدلال پیش کیا۔ اس طرح اقبال نے آہستہ آہستہ قائداعظم کو آمادہ کیا کہ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کے مطالبہ کی ضرورت پر غور کریں۔ نتیجتاً وقت آنے پر قائداعظم نے مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اس نوعیت کی ریاست کے قیام کا مطالبہ ایک قرارداد کی صورت میں پیش کیا اور یہ مطالبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی منزلِ مقصود قرار پایا۔ اس قرارداد کی منظوری کے بعد قائداعظم نے مطلوب الحسن سید سے جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کے سکریٹری تھے اور اس اجلاس میں شریک تھے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "اقبال اگرچہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوتی کہ ہم نے آخر وہی کیا جو وہ چاہتے تھے۔"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کا اجلاس "منٹو پارک" میں منعقد ہوا تھا جو مزار اقبال سے نہایت قریب واقع ہے اور جہاں قرار داد پاکستان منظور کی گئی تھی اس مقام کو یادگار بنانے کے لئے ۱۹۶۹ء میں یہاں "مینارِ پاکستان" تعمیر کیا گیا جسے دیکھنے کے لئے روزانہ ہزاروں افراد آتے ہیں۔

علیحدہ وطن کے قیام کی اشد ضرورت کے علاوہ جو بات اقبال کے ان خطوط سے ظاہر ہوتی ہے وہ ان کا قائداعظم کی ذات اور ان کی قیادت پہ گہرا ایقان و اعتماد تھا۔ چنانچہ ایک خط مؤرخہ ۱۱ جون ۱۹۳۷ء میں اقبال نے قائداعظم سے واضح الفاظ میں اس طرح خطاب کیا ہے "آج ہندوستان میں آپ واحد مسلمان ہیں جن سے قوم کو یہ توقع وابستہ کرنے کا حق ہے کہ ہندوستان پر جو طوفان آنے والا ہے اس میں آپ قوم کی صحیح رہنمائی فرمائیں گے۔" ایک اور موقع پہ علامہ اقبال نے جناح کو لکھا کہ "مسلم ہندوستان کو توقع ہے کہ ایسے نازک موقع پہ آپ کی دانشمندی موجودہ مشکلات سے نجات کی کوئی راہ نکال لے گی۔"

یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ علامہ اقبال کی امیدوں پہ قائداعظم جناح پورے اترے اور انہوں نے اقبال کے تجویز کردہ مقاصد کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کو متحد کیا۔ ان کو ہندوستان کی سیاست میں ایک ایسی قوت بنا دیا جس کو نظر انداز کرنا ناممکن تھا اور آخر کار ۱۹۴۷ء میں پاکستان حاصل کیا۔ اس طرح یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ قیام پاکستان کے سلسلہ میں اقبال نے ایک قابلِ عمل تصور پیش کیا اور قائداعظم نے اس تصور کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ ان دونوں زعماء کی کوششوں اور عام مسلمانوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اتحاد کے نتیجہ میں خدائے بزرگ و برتر کے فضل سے ایک نئی اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آیا۔

پیام اقبال

اردو اور ہندوستانی فارسی ادب میں اقبال کا مقام بڑا اہم اور واضح ہے۔ ایک شاعر کو دو زبانوں میں بیک وقت مقبولیت حاصل ہو جانا نہ کوئی معمولی بات ہے اور نہ کوئی غیر اہم۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقبال کی حیثیت اردو اور فارسی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز و منفرد رہے گی۔ پروفیسر آربری کا کہنا ہے کہ "طور سینا" میں کئی اشعار ایسے ہیں جو اپنے معنی اور مفاہیم کے اعتبار سے بڑے اعلیٰ اور ارفع ہیں اور جن کو جدید فارسی ادب کے شاہ پاروں کی پہلی فہرست میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے مرزا غالب کے بعد اقبال اس صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اقبال سنگھ نے جو غیر مسلم ہے اقبال کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اقبال کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہ مسلمان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ تصوف سے خالص علمی تعلق کی۔

اقبال سنگھ کی رائے سے ہمیں پوری طرح اتفاق ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں یہ خوبی اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ انہوں نے خیال کو خالص فکری سطح پر پیش کرنے کے بجائے خیال کو احساس میں سمو کر پیش کیا ہے اور جو چیز حسّی سطح پر پیش کی جائے اس میں ایک ہمہ گیر اور عالمگیر اثر انگیزی کا پیدا ہو جانا ایک فطری بات ہے

اقبال کا پیغام فکر و عمل کو نئی جہتوں سے روشناس کرانے کا پیغام ہے۔ انہوں نے اپنے اس پیغام کے لئے قرآن و سنّت کو بنیاد بنایا ہے اور تعلیمات قرآنی کی تفہیم کے سلسلے میں ملتِ اسلامیہ کے موجودہ رویہ کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ اہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکات پیش کیے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال کے نزدیک اسلام اجتہاد پر بہت زور دیتا ہے اور اجتہاد کے سلسلہ میں ضروری اصول بھی فراہم کرتا ہے۔ اجتہاد کا اصول یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں جامد روایت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چنانچہ بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اجتہاد کے اسلامی اصولوں کے تحت روایت میں تبدیلی اور اضافہ معاشرے کی صحت کے لئے لازمی شرط ہے۔ البتہ یہ تبدیلی اور اضافہ اسلام کے بنیادی عقائد اور قرآن پاک کے فراہم کردہ رہنما اصولوں سے متصادم نہیں ہونا چاہیئے۔

دوسری بات جس پر علامہ اقبال نے خاص طور پر زور دیا ہے وہ انسانی صلاحیتوں کی معرفت ہے۔ معرفتِ انسانی کو انہوں نے خودی سے تعبیر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن پاک کے مطابق اللہ تعالےٰ نے انسان میں اپنی روح پھونکی اور اسے اس زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا۔ پھر زمین پر اپنے اس خلیفہ کے لئے پوری کائنات کو مسخر کر دیا۔ تسخیر کے اس عمل سے متعلق اسے ہدایت کی کہ وہ کائنات پر غور کرے یعنی کائنات میں جو قوانین فطرت جاری و ساری ہیں انہیں دریافت کرے۔ قوانینِ فطرت کی ہی دریافت تسخیر فطرت کا سبب ہے اس عمل کو سائنس بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ سائنسی علوم حاصل کرنا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

علامہ اقبال کے پیغام کا سب سے اہم حصہ دعوتِ عمل ہے۔ انسان کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اور تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ جانا کسی طرح زیب نہیں دیتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ارشاد فرمایا ہے کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ کوشش کرنا عمل ہے اور اللہ تعالےٰ کے ارشاد کے مطابق انسان کا عمل ہی اس کی تقدیر ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

چند لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اقبال اپنی تمام نظمیں اردو میں کہتے تو وہ ایک بہتر شاعر ثابت ہوتے لیکن اقبال کے نزدیک زبان فقط ایک ذریعۂ اظہار تھی۔ اقبال نے فارسی میں اس لئے لکھنا شروع کیا تھا کہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے خیالات، تصوّرات، نظریات اور جذبات فارسی میں بہتر طور پر اور بآسانی ادا کر سکتے ہیں۔ مزید برآں فارسی میں شعر کہہ کر وہ اپنے خیالات عالمِ اسلام کی سطح پر ایک بڑے حلقے تک پہنچا سکتے ہیں اور یہ حلقہ صرف اردو میں شعر کہنے سے ان کی دسترس سے باہر رہے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری تمام عالمِ اسلام میں پڑھی جائے صرف ہندوستانی مسلمانوں کے حلقہ تک محدود نہ رہے۔

اقبال نے اپنے خیالات و تصورات میں بتدریج ترقی کے ساتھ ہی اپنی شاعری کے مقاصد میں بھی تبدیلی پیدا کی لیکن ایک مقصد ایسا تھا جس پر وہ ہمہ وقت قائم رہے اور یہ مقصد تھا انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جدوجہد۔ اقبال کو ہر طرح کی ناانصافی سے نفرت تھی۔ پہلے وہ ہندوستان میں ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف برسرِپیکار تھے پھر انہوں نے عالمِ اسلام کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف علمِ احتجاج بلند کیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی جدوجہد عام انسانوں کے لئے یعنی تمام ملکوں کے پسماندہ عوام کے حق میں ایک مسلسل اعلانِ جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ اس ضمن میں ان کی سب سے اہم نظم وہ ہے جس میں انہوں نے عام آدمی کا پُرجوش دفاع کیا ہے اور جس کا عنوان ہے فرمانِ خدا (فرشتوں سے):

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو
حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دیر بجھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

اقبال ایک بہت سچے، حسّاس اور درد مند مسلمان تھے۔ اس صدی کے پہلے عشرے میں مسلمانوں پر جو کوہِ غم ٹوٹے تھے انہوں نے اقبال کو بہت زیادہ متاثر کیا لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ جس چیز نے ان کو پہنچایا وہ یہ تھی کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں مسلمان اپنے طور پر قوم پرستی کا روپ دھارتے جا رہے تھے اور خود کو نسل و وطن کی بنیاد پر منظم کر رہے تھے۔ اقبال کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اس طرزِ عمل سے مسلمان عالمِ اسلام کو منقسم کر رہے ہیں۔ یہ بات اقبال کی فکر اور فلسفہ کے خلاف تھی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان رنگ، نسل اور ملک کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے روحانی رشتہ یعنی اسلام کی اساس پر خود کو منظم کریں۔ اقبال کا کہنا تھا کہ صرف اسی طرح مسلمان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے آپ کو نہ صرف ایک "ملتِ بیضا" کا حصہ ثابت کر سکتے ہیں بلکہ اپنا مقدر بھی متعین کر سکتے ہیں۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم!

ترجمہ:۔ نہ ہم افغانی ہیں نہ ترک ہیں اور نہ تاتاری۔ ہم چمن زاد ہیں اور ایک ہی شاخ سے متعلق ہیں۔ ہم پر رنگ و بو کی تمیز حرام ہے کہ ہم ایک ہی نوبہار کے پروردہ ہیں۔

رموزِ بے خودی کے بعد اقبال کا دوسرا فارسی مجموعہ "پیامِ مشرق" منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا اور اس مجموعہ کا پہلا حصہ یعنی "طورِ سینا" کو پروفیسر آربری نے ۱۹۴۷ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس مجموعہ میں اقبال نے جرمن مصنفوں اور شاعروں پر مشرقی افکار اور شاعری کے اثرات کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ ۱۹۲۴ء میں اقبال نے اپنے اوّلین اردو کلام پر مشتمل ایک مجموعہ "بانگِ درا" کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب کا نام جو عام روش سے ہٹا ہوا تھا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اقبال اپنے کلام کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنے تساہل اور جمود کے دائرہ سے نکال کر فعال بنانا چاہتے تھے۔ ان میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کے بے سروسامان کارواں کو ایک نئے اور بہتر مستقبل کی طرف گامزن کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلہ نوا قندیل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بانگِ درا کے بعد زبورِ عجم ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کے چند حصوں کا منظوم ترجمہ پروفیسر آربری (۱۹۰۵۔ ۱۹۶۹ء) نے انگریزی میں کیا تھا۔ اس کے بعد "جاوید نامہ" شائع ہوا جو اقبال کے سب سے چھوٹے صاحبزادے جاوید اقبال کے نام منسوب ہے۔ اس طویل نظم کا شمار اقبال کی بہترین شاعری میں کیا جاتا ہے اور یہ برطانوی شاعر جان ملٹن (۱۶۰۸۔ ۱۶۷۴) کی مشہور نظم "پیراڈائز لاسٹ" کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں علامہ اقبال کی روح نے مشہور فارسی شاعر جلال الدین رومی (۱۲۰۷۔ ۱۲۷۳) کے ساتھ سماوات کی سیر کی ہے۔ یہ نظم اس سیر کی سرگزشت کا نقشہ ہے۔

اس دوران میں اقبال اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں اشعار کہتے رہے اور دو مجموعے شائع ہوئے۔ پہلے "بالِ جبریل" ۱۹۳۵ء میں اور بعد میں "ضربِ کلیم" ۱۹۳۶ء میں۔ یہ دونوں اردو مجموعے انہی خیالات، تصورات اور نظریات کی بازگشت ہیں جن کا اظہار اقبال نے اس سے قبل اپنے فارسی کلام میں کیا تھا۔ ان مجموعوں میں اقبال نے ایک فعال زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے اور مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر خود کو ایک جہدِ مسلسل کے لئے مستعد اور تیار رکھیں۔

اردو کے ان تینوں مجموعوں میں سے کیرنن نے کئی منتخب نظمیں انگریزی میں ترجمہ کی ہیں جو ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ اور پھر ۱۹۵۵ء میں دوسری مرتبہ انگلستان سے شائع ہوئیں۔ بعد ازاں اقبال نے فارسی میں ایک مختصر مثنوی بعنوان "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" لکھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک اور نظم "مسافر" بھی فارسی میں لکھی۔ یہ نظم انہوں نے اپنے قیامِ افغانستان کے دوران میں کہی تھی۔ افغانستان میں قیام کے دوران میں انہوں نے سلطان محمود غزنوی اور شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے مزارات پر حاضری دی اور محمود غزنوی کے دارالحکومت غزنی کی تباہی و بربادی سے شدید متاثر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے۔ ان کی نظم "مسافر" دراصل انکے اسی تاثر کا ردعمل ہے۔ ان دونوں نظموں میں انہوں نے مشرق پر مغرب کی یلغار کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور مسلمانوں کو اسلام کے پرچم تلے متحد ہونے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کے ساتھ انصاف روا رکھتے ہوئے ان کو اپنانے کی کوشش کریں۔

اقبال کی باقی ماندہ اردو اور فارسی کی نظموں پر مشتمل ایک مجموعہ ان کی وفات کے بعد "ارمغانِ حجاز" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ اقبال کا دنیا کو آخری پیغام تھا۔ اس مجموعہ کی مختلف نظموں میں اقبال نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو موضوعِ گفتگو بناتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ یہ تعلیمات ہدایت و رہنمائی کا حتمی ذریعہ ہیں۔ ان میں روحِ عصر کارفرما ہے اور اگر ان تعلیمات کو مسلمان حقیقی معنیٰ میں اپنی زندگی کی اساس و بنیاد بنالیں تو ترقی کی نہ صرف تمام راہیں ان پر کھل جائیں گی بلکہ وہ ایک مثالی امت کی صورت میں دیگر اقوام کے لئے نمونہ اور مثال بن جائیں گے۔

شعر کہنے کے ساتھ ساتھ اقبال سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی مسلسل اور سنجیدگی سے غور کرتے رہتے تھے۔ ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء کے دوران انہوں نے مدراس، حیدرآباد (دکن) اور میسور کی یونیورسٹیوں میں اسلامی موضوعات پر علیحدہ علیحدہ تقاریر کی تھیں جو ۱۹۳۰ء میں "اسلام میں تشکیل جدید الٰہیہ" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئیں۔ یہ کتاب جہاں نثر میں ان کا سب سے اہم کارنامہ تھا۔ وہاں عالم اسلام کے لئے ان کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔ اقبال کا خیال تھا کہ جدید مسلمان کے سامنے جو سب سے اہم مسئلہ و مرحلہ ہے وہ یہ ہے کہ ماضی سے تعلق منقطع کئے بغیر اسلامی نظام کی از سرِ نو تشکیل پر غور کیا جائے اور یہ مستحسن کام اقبال نے خود اپنے مذکورہ خطبات میں سرانجام دینے کی کوشش کی ہے۔ ان خطبات میں انہوں نے مسلمانوں کو استدلال کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ کس طرح حقیقی معنیٰ میں مسلمان رہ کر بھی جدید سائنس اور دیگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علوم سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسلام کس طرح مختلف علوم و فنون اور سائنس پہ دسترس حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اقبال نے اس طرح مسلمانوں کو اسلام سے زیادہ قریب لانے اور اسلام پہ ان کے ایقان کو مزید مستحکم کرنے کی ایک سعی مستحسن انجام دی۔ انہوں نے مسلمانوں کے سامنے ایک فلسفۂ زندگی پیش کیا جس پہ وہ بآسانی عمل کر سکتے تھے۔ چنانچہ امیر شکیب ارسلان کا کہنا ہے کہ گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران میں اسلام نے جو مفکر پیدا کئے ان میں اقبال کا مقام سب سے ممتاز ہے۔ اس لئے یہ بات قطعی تعجب خیز نہیں کہ ان کے خطاب روز اوّل سے ہی ہندوستان اور ہندوستان سے باہر علماء فضلاً اور مفکروں کے لئے توجہ کا مرکز، موضوعِ بحث اور قابل ستائش قرار پائے۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال کو آکسفورڈ یونیورسٹی کی جانب سے RHODES لیکچرر کی حیثیت سے دعوت نامہ موصول ہوا لیکن اقبال اپنی علالت کے باعث یہ دعوت نامہ قبول نہیں کر سکے۔

اقبال کے آخری ایام

اقبال فروری ۱۹۳۲ء میں یورپ سے واپس آئے اور اس کے سات ماہ بعد ہی وہ والئی افغانستان نادر شاہ کی دعوت پہ افغانستان گئے۔ اس سفر میں مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳) اور سید راس مسعود (۱۸۸۹-۱۹۳۷) ان کے ہمسفر تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی ایک مشہور عالمِ دین، تاریخ دان مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) کے جانشین اور دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مہتمم تھے جب کہ سید راس مسعود اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے پوتے تھے۔ نادر شاہ نے ان ماہرین تعلیم کو اس لئے افغانستان آنے کی دعوت دی تھی کہ وہ حکومت افغانستان کو یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مشورہ دیں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مزید یہ کہ افغانستان میں اعلےٰ تعلیم کے فروغ کے لئے ایک ایسا منصوبہ بنائیں جو اسلامی اقدار کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مغربی علوم سے متصف ہو۔

دورۂ افغانستان میں اقبال غزنی بھی گئے جو ایک زمانے میں سلطان محمود غزنوی (۹۷۱-۱۰۳۰) کا دارالحکومت تھا لیکن اب اس پر ویرانی ہی ویرانی برس رہی تھی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے جو والیٔ غزنی تھا ہندوستان پر سترہ مرتبہ حملہ کیا اور ہر حملہ میں مقامی راجاؤں کو شکست دی۔ ۱۰۰۱ء سے ۱۰۲۷ء تک محمود غزنوی کے حملوں اور یلغار کا ہندوستان میں ہر طرف شہرہ تھا۔ ان حملوں میں جہاں وہ ایک طرف وسطی ہند میں قنوج اور متھرا تک پہنچ گیا جو ہندوؤں کے نہایت اہم مراکز تھے تو دوسری طرف اُس نے مغربی ہندوستان کے شہر گجرات کے علاقہ میں واقع ہندوؤں کے سب سے اہم مندر سومنات کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ البتہ محمود غزنوی نے صرف پنجاب کے علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس اعتبار سے بھی محمود غزنوی سے اقبال کا تعلق اور رشتۂ عقیدت مزید مستحکم ہو گیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں غزنی ایک متمول اور شہرۂ آفاق شہر ہونے کے علاوہ تہذیب و تمدن کا ایک عظیم گہوارہ تھا لیکن اب اس کی یہ عظمت قصۂ پارینہ ہو چکی تھی۔ اس کے شاندار محل اور پُر رونق کوچہ و بازار اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ہر طرف ایک ہُو کا عالم طاری تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر اقبال کا دردمند دل لہو رونے لگا اور وہ شدید اذیت میں گرفتار ہو گئے۔ ایک ناقابلِ بیان ذہنی خلفشار کا شکار۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی نظم "مسافر" میں کیا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے اللہ تعالےٰ سے التجا کی ہے کہ وہ مصائب و آلام سے مسلمانوں کو نجات دے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کی موجودہ دگرگوں اور ابتر صورتِ حال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا کہ مسلمان زندگی کا ولولہ کھو بیٹھے اور انہوں نے اپنی اقدار کی جانب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے منہ موڑ لیا۔ اقبال نے جب سلطان محمود غزنوی اور مغلیہ سلطنت کے بانی سلطان ظہیر الدین بابر (۱۴۸۳ - ۱۵۳۰) کے مزارات پہ حاضری دی تو وہاں بھی انہوں نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا مگر ان کو یہ دیکھ کر اطمینان اور مسرت ہوئی کہ افغان ابھی اپنی آزادی کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہیں۔

افغانستان سے واپسی کے بعد اقبال کی صحت بتدریج گرنے لگی۔ پہلی بار اقبال ۱۹۲۴ء میں شدید بیمار ہوئے تھے جب ان کو گردوں کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اس وقت انہوں نے دہلی کے شہرۂ آفاق حکیم نابینا سے علاج کروایا اور صحت یاب ہو گئے۔ اس کے بعد اقبال کی صحت دس سال تک قدرے بہتر رہی لیکن ۱۹۳۴ء میں گلے کی خرابی کی بنا پر ان کے لئے بات کرنا بھی محال ہو گیا۔ یہ مرض اس قدر بڑھ گیا تھا کہ برقی طریقۂ علاج کے باوجود اقبال مکمل طور پہ صحت یاب نہیں ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں وہ ایک بہت بڑے سانحے سے دوچار ہوئے اور وہ تھا ان کی تیسری بیوی کا انتقال جو جاوید اور منیرہ کی والدہ تھیں۔ بیوی کے انتقال کے بعد اقبال اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بہت تنہا رہ گئے۔ وہ ہر وقت غمزدہ رہنے لگے۔ نتیجتاً گردوں کے مرض نے از سرِ نو غلبہ پا لیا اور ان کی صحت روز بروز گرتی ہی چلی گئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان کی آنکھ میں موتیا اتر آیا اور وہ کسی حد تک بینائی سے بھی محروم ہو گئے۔

ان تمام آلام و مصائب کے باوجود اقبال کی مطالعہ میں دلچسپی قائم رہی۔ اور وہ ہندوستان کے مسلمانوں اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں پہلے کی طرح متفکر رہے۔ کومہ کے دوروں کی متواتر یلغار کے درمیان بھی وہ اپنے حلقہ بگوشوں اور احباب سے مسلم دنیا کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اقبال اس زمانہ میں قائداعظم جناح سے مستقل رابطہ قائم کئے ہوئے تھے اور ان کو ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام پر آمادہ کرنے کے لئے مسلسل خطوط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لکھ رہے تھے۔ بیماری کے زمانہ میں اقبال کی تشویش کا باعث ان کی طرف بڑھتی ہوئی موت کے قدموں کی چاپ نہیں تھی بلکہ عالم اسلام کے حالات تھے جو بتدریج مخدوش ہوتے جا رہے تھے۔ اقبال مستقبل کے بارے میں زیادہ پُر امید نہیں تھے یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی جب وہ مسلمانوں کو درپیش مسائل کا ذکر کرتے تھے تو ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔

مارچ ۱۹۳۸ء کے آواخر میں اقبال کی بیماری شدت اختیار کر گئی۔ ان کا قلب کمزور پڑ گیا اور وہ بہترین طبی امداد اور دیکھ بھال کے باوجود ۲۱ اپریل کی درمیانی شب اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کا انتقال بغیر کسی تکلیف کے اچانک ہو گیا۔ بقول ایس اے واحد وہ انتقال کے بعد بسترِ مرگ پر نہایت سکون اور اطمینان سے لیٹے ہوئے تھے جیسے وہ اپنا کام ختم کرنے کے بعد آرام کے لئے لیٹے ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال کے انتقال سے چند دن قبل جب ان کے بھائی نے علامہ کی علالت پر شدید افسوس کا اظہار کیا تو اقبال نے ان سے کہا کہ "میں مسلمان ہوں اس لئے موت سے خوف نہیں کھاتا"۔ درحقیقت اقبال کو موت سے خائف ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ "دوامِ زندگی" پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

علامہ اقبال کے انتقال کی خبر لاہور ریڈیو اسٹیشن سے جیسے ہی نشر کی گئی لوگوں کا ایک ہجوم جس میں امیر و غریب، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ، خواتین اور بچے سبھی شامل تھے علامہ اقبال کی رہائش گاہ کے اطراف جمع ہو گیا۔ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے اسکول، کالج اور عدلیہ کے دفاتر بند کر دیئے گئے۔ ان کے جلوسِ جنازہ میں تقریباً ساٹھ ہزار افراد شریک تھے اور ۲۱ اپریل کی شام کو بادشاہی مسجد کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سائے میں ان کا جسدِ خاکی سپردِ لحد کر دیا گیا۔ اس طرح علامہ اقبال اسی مسجد کے پہلو میں دفن ہوئے جہاں وہ اپنی جذبات سے بھرپور نظمیں اپنی سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی مترنم آواز میں سنا کر سامعین پر رقت طاری کر دیتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ آواز اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی لیکن وہ پیغام جس کو اس آواز نے عام کیا تھا ہمیشہ نہ صرف عالمِ اسلام کے قلب کو حرکت و عمل اور ولولۂ تازہ سے ہمکنار کرتا رہے گا بلکہ ایک علمی اور فکری کارنامہ کی حیثیت سے بھی ہمیشہ زندہ و پائندہ رہے گا۔

علامہ اقبال کی رحلت تمام ہندوستان کے لئے ایک عظیم سانحہ تھی۔ اس سانحہ کی اطلاع دوسرے ملکوں میں بھی جہاں اقبال اپنی شاعری اور تعلیمات کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے شدید دکھ اور رنج و غم کا باعث ہوئی۔ گو کہ اقبال کی شہرت اس زمانے میں ہندوستان سے باہر اتنی نہیں تھی جتنی کہ آج ہے لیکن اس کے باوجود بیرونِ ملک بھی ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

گزشتہ ۳۷ سال میں اقبال کی شاعری کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے اور ان کی زندگی، شاعری اور فکر و فن پر کئی زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جس سے اقبال کی ہمہ گیر مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ اقبال کا پیش کردہ ہندوستان میں ایک علیحدہ مسلم مملکت کا تصور مارچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ اور اسلامیانِ ہند کے حتمی نصب العین کی شکل اختیار کر گیا۔ علامہ جنہوں نے نہ صرف یہ تصور پیش کیا بلکہ اپنی تصانیف کے ذریعہ مسلمانانِ ہند میں اس تصور کی روشنی میں ایک علیحدہ مملکت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا ولولہ پیدا کیا تھا اب پاکستان کے قومی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علامہ اقبال کی رحلت کے تقریباً آٹھ سال بعد ان کی قبر پر ایک مقبرہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ زین یار جنگ نے جو حیدر آباد دکن کے ایک مشہور ماہر تعمیرات تھے ابتداً مقبرہ کا ایک ماڈل تیار کیا جسے اقبال مقبرہ کمیٹی نے منظور کر لیا۔ افغانستان نے علامہ اقبال سے عقیدت کے اظہار کے طور پر مقبرہ کے لئے سنگِ مرمر فراہم کیا اور بہت جلد ہی اقبال کی قبر پر ایک سادہ لیکن پُر تقدس مقبرہ تعمیر ہو گیا۔ مقبرہ کی پیشانی پر اقبال کا وہ قطعہ کندہ ہے جس کا مصرعۂ اوّل یہ ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم

اگرچہ ۱۹۲۰ء کے عشرہ میں اقبال ایک عالمگیر شہرت کے حامل ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ سادہ اور ہر قسم کے تکلف سے عاری زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ ان کی ضروریات محدود تھیں۔ قناعت ان کی زندگی کا جزوِ خاص تھی۔ چنانچہ وہ اپنے خاندان کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے پر ہی اکتفا کرتے تھے اور اس میں خوش تھے۔ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے صرف اس لئے وکالت چھوڑ دی کہ وہ اپنا تمام تر وقت تصنیف و تالیف میں گزار سکیں۔ یعنی وہ حصول آسائش کی خاطر اپنی فکری پرواز میں کسی قسم کی کوتاہی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں بھوپال کے نواب نے ان کے لئے پانچسو روپے ماہوار کی پنشن مقرر کی جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام آرام سے گزار سکے۔

ہر چند اقبال کا شمار ۱۹۲۰ء سے ہندوستان کی اہم اور مشہور ترین شخصیات میں ہونے لگا تھا لیکن اس کے باوجود ان کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ گرمجوشی اور بلا کسی تصنّع کے ہر ایک کے ساتھ ملنا ان کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ اسلامی روایات کے مطابق مہمان نوازی کا حتی المقدور حق ادا کرتے تھے۔ خوش خوراک تھے اور شمالی ہندوستان کے دیگر مسلمانوں کی طرح پلاؤ اور سیخ کباب ان کی مرغوب غذاؤں میں شامل تھے۔ کم نمک اور بغیر دودھ کی چائے کثرت سے نوش فرمایا کرتے تھے۔ گرمیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں علامہ اقبال اپنا بستر باغ میں لگا دیتے تھے اور اکثر پنجابی لباس میں رہتے تھے کیونکہ یہ لباس عام حالات میں زیادہ آرام دہ واقع ہوتا ہے۔ ان کے بستر کے اطراف کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر ان کے احباب اور ملاقاتی بیٹھے رہتے تھے۔ سردیوں میں اسی طرح کا انتظام ان کے گھر کے اندر ہوتا تھا جب کہ حقہ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا۔

علامہ اقبال کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لئے ان کے مداح دور دراز مقامات سے ان کے ہاں حاضری دیتے اور یہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا تھا۔ چونکہ علامہ اقبال بہت دلچسپ گفتگو کرتے تھے اس لئے یہ ملاقاتیں بھی بڑی دلچسپی کی حامل تھیں۔ اقبال ایک اچھے سامع بھی تھے اور ان کی صحبت نہایت خوش کن ہوتی تھی۔ اقبال کی محفلوں میں مختلف موضوعات پر بحث ہوا کرتی تھی لیکن خاص طور پر ان کے آخری ایام میں جس عنوان پر سب سے زیادہ گفتگو ہوتی تھی، وہ موضوع تھا "اسلام اور اس کا مستقبل"۔ اقبال کی گفتگو فکر انگیز ہوتی تھی مگر بسا اوقات وہ اپنی گفتگو میں مزاح کا عنصر شامل کر کے ان محفلوں کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔

علامہ اقبال ایک نیک نیت اور مذہبی شخص تھے اور یہ وہ اوصاف تھے جو انہوں نے اپنے والد سے سیکھے اور ان کے استاد سید میر حسن کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ علامہ اقبال کا ایمان تھا کہ اسلام دنیا کو بہتر سے بہتر بنانے کا واحد نظام ہے۔ چنانچہ اسلامی روایات اور اصولوں کو اقبال نے اپنی روزمرہ زندگی میں اپنانے کی مکمل کوشش کی۔ وہ احکام الٰہی کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور صوم و صلوٰۃ کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرتے۔ قرآن حکیم کی تلاوت ان کا معمول تھا جب ان کی نظر کمزور ہو گئی تو وہ دوسروں سے قرآن شریف سنا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے یا سنتے وقت ان پر رقت طاری نہ ہوئی ہو۔

علامہ اقبال بہت خوش خط تھے۔ اس کا اندازہ اس نمونہ سے بھی ہوتا ہے جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ ان کے پاس میز پر نوٹ بک اور پنسل رکھی رہتی تھی۔ تاکہ بوقت ضرورت اشعار قلمبند کر سکیں۔ اقبال نے ہزاروں اشعار لکھے خصوصاً جب آمد ہو رہی ہوتی تو وہ گھنٹوں اشعار لکھتے رہتے تھے۔

اقبال کو خود پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنے نجی آلام و مصائب سے کبھی پریشان نہیں ہوتے تھے اور ہر وقت ایک اطمینان کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان کے بارے میں بھی انہیں یقین تھا کہ ان کی یہ کاوشیں اسلامیان ہند کے لئے جو ترقی اور عظمت رفتہ کے متلاشی ہیں ہمیشہ اکسیر اور مہمیز کا کام کرتی رہیں گی۔ انتقال سے نصف گھنٹہ قبل اقبال نے ایک قطعہ کہا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

ترجمہ:۔ گزرا ہوا نغمہ واپس آئے کہ نہ آئے۔ حجاز سے نسیم کا جھونکا آئے کہ نہ آئے۔ اس عہد کا یہ فقیر تو ظاہر ہوا لیکن نہ جانے کوئی دوسرا دانائے راز آئے کہ نہ آئے۔

دوسرا دانائے راز آئے یا نہ آئے لیکن وہ آواز جس نے ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد پر ایک رقت کا عالم طاری کر دیا اور ان کو اپنی موجودہ ناگفتہ بہ حالت سے روشناس کرایا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ وہ نوجوان شاعر جو ۱۹ سو کی اس یادگار انجمن حمایت الاسلام کی تقریب میں سامعین کی توجہ اور داد و تحسین کا مرکز بن گیا تھا وہ آج اپنی آخری آرام گاہ میں ابدی نیند سو رہا ہے لیکن اس کا پیغام ہمیشہ عالم اسلام کو بیداری اور جہد مسلسل کی دعوت دیتا رہے گا۔ وہ پیغام جو آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندہ رہے گا۔

یہ تھے علامہ اقبال جو شاعر اور مفکرِ اسلام کی حیثیت سے برصغیر کے افق پر ۱۹۲۰ء کے عشرہ میں نمودار ہوئے اور جن کو قائداعظم محمد علی جناح نے ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

> علامہ اقبال میرے ذاتی دوست تھے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ تا قیامت زندہ رہیں گے۔ ان کی عظیم شاعری اسلامیانِ ہند کی امنگوں، آرزوں اور جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ شاعری ہمارے لئے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی رہے گی۔

آج بھی ہم سب کے لئے اقبال کا پیغام ایک دعوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال نے جرأت مندانہ زندگی کا نصب العین اور ایک ایسا فلسفۂ حیات پیش کیا جسے ہم آج بھی اپنی روزمرّہ کی زندگی میں اپنا سکتے ہیں۔ وہ راہ جس کی علامہ اقبال نے نشاندہی کی تھی وہ آج بھی دنیا کو بہتری کی سمت لے جا سکتی ہے اگر ہم خود کو اس راہ پر گامزن کریں تو ہم بھی تازہ بستیاں آباد کر سکتے ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اقبال منزل"، سیالکوٹ
(بائیں) جہاں علامہ اقبالؒ
کی ولادت ہوئی

"جاوید منزل" لاہور
(نیچے) جہاں علامہ اقبالؒ
نے وفات پائی۔

www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

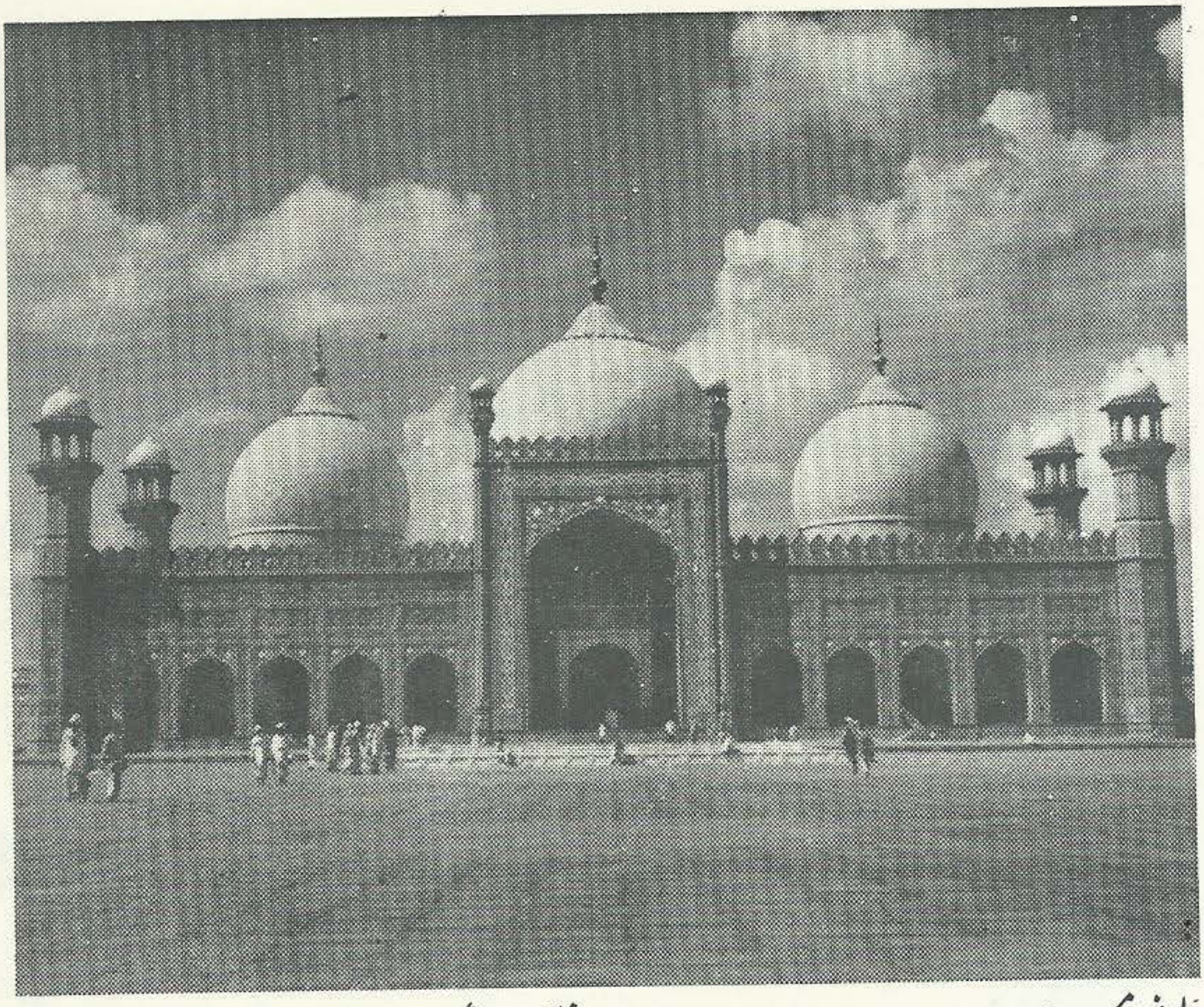

بادشاہی مسجد لاہور (اوپر) جہاں علامہ اقبالؒ نے اپنی متعدد نظمیں سنائیں (نیچے) مسجد کے پہلو میں علامہ اقبالؒ کی آخری آرامگاہ !

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

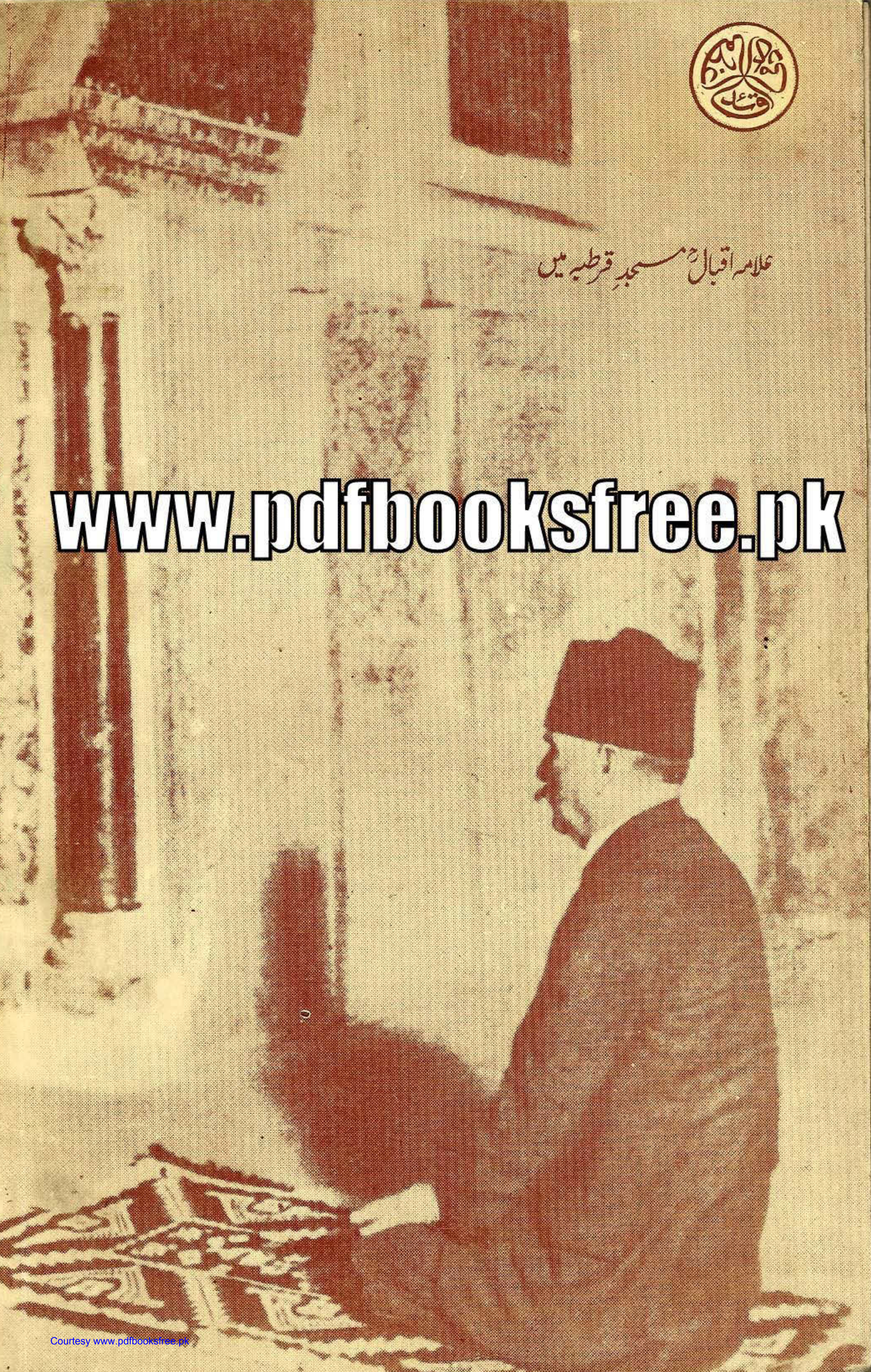

علامہ اقبالؒ مسجدِ قرطبہ میں

www.pdfbooksfree.pk
Courtesy www.pdfbooksfree.pk